جامِ صہبا

ابوالخیر سیّد ابراہیم حسینی صہبا
بی۔ اے (عثمانیہ)

"شاعری کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے
اس کی استعداد خداداد ہوتی ہے
جو شخص اس عطیۂ الہٰی کو
متقضائے فطرت کے موافق
کام میں لائے گا ممکن نہیں
کہ اس سے
سوسائٹی کو کچھ
نفع نہ پہنچے۔"
حالی

اگست ۱۹۶۱ء

بار
اوّل
۱۰۰۰
قیمت دو روپے
نیشنل بک ڈپو
مچھلی کمان حیدرآباد
کاتب :- محمد مظہر

طباعت :- نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چار کمان۔ حیدرآباد

حمد

ہر باغ میں کوہسار میں تو ہی تو ہے
ہر خار میں گلزار میں تو ہی تو ہے
اک کن سے دو عالم کو بنانے والے
ہر ساز کی جھنکار میں تو ہی تو ہے

۱۹۲۵ء

یہ سچ ہے کہ تو دل میں مکیں رہتا ہے
جس طرح انگوٹھی میں نگیں رہتا ہے
پاتی نہیں پھر بھی تجھے عقلِ انساں
کہتے ہیں کہ شہ رگ سے قریں رہتا ہے

۱۹۴۶ء

کوئی نہ اس طرح دنیا سے بے زباں گذرے
کہ دل کی بات رہے دل میں اور گراں گذرے
ہر اک کی منزل مقصود تھی جُدا گانہ
مری نظر سے ہزاروں ہی کارواں گذرے
وہی حرم میں وہی دیر میں نظر آیا
وہی ہمیں نظر آیا جہاں جہاں گذرے
زمانہ ہم کو نہ بھولے گا اک زمانے تک
کہ ہم بھی چھوڑ کے اپنا یہاں نشاں گذرے
ہے مختصر سی محبت کی داستاں لیکن
بہت سے ذہن میں عنوانِ داستاں گذرے
کسی بھی دور میں ہم رنگ آسماں نہ رہے
نظر سے اپنی کئی دورِ آسماں گذرے
ہمیں تو لطف نہ اس زندگی میں کچھ آیا
ہم اس جہان سے صہبا کشاں کشاں گذرے

اکتوبر ۵۲ء

یاد جب اُن کی مجھکو آتی ہے
دل کی دُنیا بدل ہی جاتی ہے

بج رہا ہے نفس کا اب ہر تار
بات دل کی زباں پہ آتی ہے

حسن اب لے رہا ہے انگڑائی
ان کی آنکھوں میں نیند آتی ہے

ہر نفس ایک کشمکش سی ہے
سانس آتی ہے سانس جاتی ہے

دیکھ کر شانِ زندگی صہبا
موت رہ رہ کے مسکراتی ہے

دسمبر ۵۲ء

وہ ساتھ ساتھ لیے پھر رہے ہیں میخانے
چھلک نہ جائیں کہیں مجکو ڈر ہے پیمانے

جو اٹھ کے جانے لگے در سے تیرے دیوانے
تو بڑھ کے چار قدم آ گئے ہیں ویرانے

زباں خموش ہے آنکھوں میں کوئی اشک نہیں
سنا رہا ہوں غمِ زندگی کے افسانے

غمِ حیات کو ہنس ہنس کے ٹال دیتا ہے
یہی شعار کیا اختیار صہبا نے

دسمبر ۵۳ء

مسرت اور غم کے اشک پیہم کا جو سنگم ہوں
ان آنکھوں کو ہمیں گنگ و جمن کہنا ہی پڑتا ہے

یہ مانا زندگی اپنی یہاں پر اک مصیبت ہے
مگر ہر حال میں اس کو وطن کہنا ہی پڑتا ہے

ادھر منہ بند کلیوں کا ادھر ہیں پھول مرجھائے
مگر صد حیف اس کو بھی چمن کہنا ہی پڑتا ہے

زمانہ نے اڑائیں دھجیاں میرے گریباں کی
مگر اس پر بھی اس کو پیرہن کہنا ہی پڑتا ہے

جہاں دو چار ساتھی ہم زباں ملتے ہوں اے صہبا
اسی کو بزم، محفل، انجمن کہنا ہی پڑتا ہے

جنوری ۵۳ء

کسی کی یاد پھر آنے لگی ہے
مجھے رہ رہ کے تڑپانے لگی ہے
ادھورے آشیاں کو برقِ مضطر
ابھی سے آنکھیں دکھلانے لگی ہے
نویدِ فصلِ گل آئی ہے شاید
کلی دل کی جو مرجھانے لگی ہے
کسی کی زلف برہم ہو رہی ہے
گھٹا غم کی ادھر چھانے لگی ہے
محبت کے اثر سے آنسوؤں میں
ستاروں کی چمک آنے لگی ہے
نہیں معلوم کیوں دنیا سے صہبا
طبیعت میری اکتانے لگی ہے

جنوری ۵۳ء

کسی کی یاد میں دیوانہ وار گذری ہے
یہ چاندنی بھی طبیعت پہ بار گذری ہے

تمام رات رہے دیکھتے ستاروں کو
کچھ اس طرح سے شبِ انتظار گذری ہے

نہ ایک پھول کھلا اور نہ اک کلی چٹکی
چمن سے سنتے ہیں بادِ بہار گذری ہے

بس اتنا یاد ہے یہ زندگی محبت میں
گذر گئی ہے مگر سوگوار گذری ہے

رہِ حیات کی منزل نہ تھی کوئی صہبا
تمام عمر سرِ رہگذار گذری ہے

مئی ۵۳ء

راز الفت کے یا خدا جانے
یا سمجھتے ہیں تیرے دیوانے
اشک آنکھوں میں کیوں لگے آنے
ہو گیا دل کو کیا خدا جانے
زخم پھر دل کے ہو رہے ہیں ہرے
پھر نظر آ رہے ہیں ویرانے
غم کے ماروں کی کون سنتا ہے
ناشنیدہ ہیں ان کے افسانے
کیا کہوں کیف ان کی آنکھوں کا
اک نظر سو ہزار میخانے
پوچھ لیں اپنے آستانے سے
حال صہبا کا غیر کیا جانے

مئی ۱۹۵۳ء

نشۂ حسن میں وہ چُور نظر آتے ہیں
آج کچھ اور بھی مغرور نظر آتے ہیں

پاس رہتے ہوئے جو دور نظر آتے ہیں
راز کچھ اس میں بھی مستور نظر آتے ہیں

جو الجھتے ہیں نشیب اور فراز رہ سے
منزلوں سے وہ بہت دور نظر آتے ہیں

جن کو امواج و تلاطم نے ڈرا رکھا ہے
ان کو ساحل بھی بہت دور نظر آتے ہیں

دھڑکنیں تیز ہوی جاتی ہیں صہبا دل کی
آج آنے پہ وہ مجبور نظر آتے ہیں

جون ۵۳ء

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

دل میں اپنے شرار رکھتا ہوں
آنکھیں خونناب بار رکھتا ہوں

اک دلِ داغ دار رکھتا ہوں
گلشنِ پُر بہار رکھتا ہوں

مژدۂ نوبہار سے حاصل
دامنِ تار تار رکھتا ہوں

کن امیدوں پہ کچھ نہیں معلوم
آرزوئے بہار رکھتا ہوں

آپ چھیڑیں نہ میرے دل کے تار
نغمۂ سوگوار رکھتا ہوں

جولائی ۵۳ء

نعت

تمھاری ذاتِ اقدس اے پیمبرؐ
ہے سب سے ارفع و اعلیٰ و بہتر
ادا پھر بھی نہ ہو گی نعتِ سرور
بسا دوں گر دہن میں بوئے عنبر
بھلا چمکے نہ کیوں میرا مقدّر
تمھاری یاد دل میں نام لب پر
تمھارے در کی حاصل ہے غلامی
حقیقت میں ہے یہ شاہی سے بہتر

نہ خوش ہوں مورد الزام کر کے
انھیں کیا مل گیا بدنام کر کے

رہے آباد مے خانہ تمھارا
مجھے خوش کر دیا خوش کام کر کے

حجابِ حُسن گویا ہو رہا ہے
رموزِ عشق طشت از بام کر کے

نویدِ فصلِ گل وہ دے رہے ہیں
مری دیوانگی کو عام کر کے

اٹھاؤ اب نہ تم صہبا کو ناحق
ہوئی کچھ دیر ہی آرام کر کے

دسمبر ۵۳ء

ابھی چاکِ گریباں دیکھنا ہے
ابھی فصلِ بہاراں دیکھنا ہے
قیامت ہے کہ ان کا سامنا ہے
مجسّم بن کے حیراں دیکھنا ہے
نظر آتے ہیں وہ میخانہ بردوش
مجھے مقسومِ رنداں دیکھنا ہے
ابھی فتنے ہیں کچھ سوئے ہوئے سے
انھیں محشر خراماں دیکھنا ہے
یہ ہے آغاز۔ اب انجامِ محفل
تجھے شمعِ فروزاں دیکھنا ہے
ابھی وہ پھول ہیں مجھکو تو صہبا
گلستاں در گلستاں دیکھنا ہے

دسمبر ۵۳ء

مجھے اپنا بنا کر دیکھ تو لو
ذرا نظریں ملا کر دیکھ تو لو

تڑپ موجوں کی ہے کس درجہ دلکش
کنارِ آب آ کر دیکھ تو لو

مریضِ غم اسی کا منتظر ہے
ذرا نظریں ملا کر دیکھ تو لو

جلا کرتا ہے کیوں کر خرمنِ دل
کبھی تم مسکرا کر دیکھ تو لو

رہے سرشار ساری عمر صہبا
نظر سے کچھ پلا کر دیکھ تو لو

دسمبر ۵۳ء

غم کی جب واردات کچھ بھی نہ تھی
قلب کی کائنات کچھ بھی نہ تھی

آنکھوں آنکھوں میں چپکے چپکے سے
ہوگئی بات، بات کچھ بھی نہ تھی

تم کو جی بھر کے دیکھنے کے سوا
آرزوئے حیات کچھ بھی نہ تھی

آپ نے مسکرا کے جب دیکھا
برق کی کائنات کچھ بھی نہ تھی

آشیاں جب نہ تھا تو بجلی کی
نگہِ التفات کچھ بھی نہ تھی

شکوۂ یار کے سوا صہبا
داستانِ حیات کچھ بھی نہ تھی

اپریل ۵۴ء

واقعات شباب یاد آئے
مے و چنگ و رباب یاد آئے

عہد ماضی کے واقعات ہیں خواب
وہی رنگین خواب یاد آئے

یہ ہوائے خنک یہ کالی گھٹا
دور ہائے شراب یاد آئے

اپنی ہستی کا جب خیال آیا
نقش ہائے پر آپ یاد آئے

مسکراہٹ میں ان کی اے صہبا
برق کے اضطراب یاد آئے

مئی ۵۴ء

گری ہے جب سے بجلی آشیاں پر
نظر اٹھنے لگی ہے آسماں پر

رہے پاسِ ادب اے دیدۂ و دل
بلایا ہے انھوں نے آستاں پر

یہ کیسی فصلِ گل آئی ہے یارب
اداسی چھا گئی ہے گلستاں پر

نہیں معلوم کیا ہو حشر دل کا
کسی کا نام ہے میری زباں پر

چلو چل کر ذرا اصہبا کو دیکھیں
یہ کیسا شور ہے اس کے مکاں پر

مئی ۵۴ء

ترے جود و کرم کی تھاہ پہچانی نہیں جاتی
جنوں کی خیر بھی ہو چاک دامانی نہیں جاتی

کسی کے ہجر میں یہ حال کیوں ہوتا ہے کیا جانے
تموّج دل میں ہے، اشکوں کی طغیانی نہیں جاتی

اسی کا نام حیرت ہے، اسی کا نام الفت ہے
یہ گھر جب دل میں کرتی ہے بآسانی نہیں جاتی

درخشاں دل میں یادِ یار بھی ہے داغِ حسرت بھی
زہے قسمت کہ میرے دل کی تابانی نہیں جاتی

انھیں کو دیکھتا ہوں پھر بھی حسرت ہے انھیں دیکھوں
کمالِ شوق ہے آنکھوں کی حیرانی نہیں جاتی

محبّت کو محبّت کے سوا پرکھا نہیں جاتا
بجز اس کے کسی صورت یہ پہچانی نہیں جاتی

تجھے ہے وہم صہبا "وہ نہیں قائل محبت کے"
محبت میں محبّت ہی تو پہچانی نہیں جاتی

اکتوبر ۵۴ء

کیا کہوں سب کچھ وہ فرماتے ہیں ہنستے بولتے
گتھیاں میری وہ سلجھاتے ہیں ہنستے بولتے

ہے یقیں اٹھیں گے ان کی بزم سے با چشمِ نم
گو بصد ارمان ہم جاتے ہیں ہنستے بولتے

ہر قدم پر یاس کا سامان آتا ہے نظر
پھر بھی اپنے دل کو بہلاتے ہیں ہنستے بولتے

مسکراتے جو نظر آتے ہیں رنج و درد میں
اس جہاں سے وہ گذر جاتے ہیں ہنستے بولتے

درد و غم کو مسکرا کر ٹالتے ہیں ہر گھڑی
اس لیے صہبا نظر آتے ہیں ہنستے بولتے

آپ کے غم سے پیار ہو کے رہا
ہر ستم خوشگوار ہو کے رہا

سچ تو یہ ہے تری محبت کا
اشک آئینہ دار ہو کے رہا

بار جب مجھ پہ ہو گئی دنیا
میں بھی دنیا پہ بار ہو کے رہا

بجھ گئی شمع چھپ گئے تارے
اب یہ انجام کار ہو کے رہا

بجلیاں گر گئیں نشیمن پر
تنکا تنکا شرار ہو کے رہا

رازدارِ بہار اے صہبا
دامنِ تار تار ہو کے رہا

۵۵ء

کسی کے ہنستے اشاروں نے ساتھ چھوڑ دیا
وہ کیف بار نظاروں نے ساتھ چھوڑ دیا

خزاں میں لطف اٹھاتا ہوں دل کے داغوں سے
نہیں ہے غم جو بہاروں نے ساتھ چھوڑ دیا

قدم قدم پہ نشیب و فراز آتے ہیں
خود آگہی کے سہاروں نے ساتھ چھوڑ دیا

شبِ فراق کے ساتھی بھی دور ہوتے ہیں
ہمارا چاند ستاروں نے ساتھ چھوڑ دیا

ہر ایک موج کو ساحل سمجھ رہا ہوں میں
سنا ہے جب سے کناروں نے ساتھ چھوڑ دیا

گلہ بہاروں سے مجھ کو نہیں رہا صہبا
ملال یہ ہے کہ خاروں نے ساتھ چھوڑ دیا

نومبر ۵۶ء

تمھارے در پہ جھکنے کی تڑپ ہے
مجھے تو ناز ہے اپنی جبیں پر
اسی امید پر میں جی رہا ہوں
مری بگڑی بنانا روزِ محشر
بہت مشتاق ہے صہبا تمھارا
عطا ہو اس کو بھی اک جامِ کوثر

اکتوبر ۵۰ء

برق ہے یا شرر نہیں معلوم
کیا ہے ان کی نظر نہیں معلوم

لے چلا ہے خیالِ یار مجھے
جا رہا ہوں کدھر نہیں معلوم

وہ ہر اک شے میں ہو کے جلوہ نما
کیوں ہوا مستتر نہیں معلوم

اٹھ رہے ہیں قدم سوئے منزل
کون ہے راہ بر نہیں معلوم

وہ بھی گردش میں ہیں جنھیں صہبا
دورِ شمس و قمر نہیں معلوم

جنوری ۵۷ء

خدا کے واسطے کچھ تو خبر لو زلفِ برہم کی
دگرگوں ہو رہی اب تو حالت ایک عالم کی

یہی ہے میرا رہبر اور نشانِ کامرانی بھی
مجھے تو ہر قدم پر ہے ضرورت آپ کے غم کی

نہ تم میں تاب سننے کی نہ ہم میں تاب کہنے کی
کہ آ پہنچی ہے شاید آخری منزل بھی اب غم کی

نظارے مسکراتے تھے فضائیں جھوم جاتی تھیں
بس اتنی یاد باقی ہے کسی کے لطفِ پیہم کی

کیا ہے جس نے پیدا اس کو میری فکر بھی ہوگی
کروں میں کس لیے اب فکر صہبا بیش اور کم کی

فروری ۵۷ء

کسی کو ایک نظر دیکھنا بہانہ تھا
تمام عمر تڑپنا تھا تلملانا تھا

کسی بھی حال جبیں پر شکن نہیں آئی
غمِ حیات پہ ہم کو تو مسکرانا تھا

کوئی یہ معجزۂ ذوقِ بندگی دیکھے
جہاں بھی جھک گیا سر اس کا آستانہ تھا

نگاہِ شوق۔ امید و فا۔ دلِ محزوں
ہمارے ساتھ بھی دُنیا تھی اک زمانہ تھا

نگاہ یار تھی جس وقت ساتھ صہبا کے
تو اختیار میں اس کے بھی اک زمانہ تھا

جون ۵۸ء

جو اشک آنکھوں میں تیرے لیے مچلتے ہیں
وہ پہلے آرزو بن بن کے دل میں پلتے ہیں

جو اپنے عزم و ارادے سے کام لیتے ہیں
رہِ حیات میں گر گر کے وہ سنبھلتے ہیں

فلک بھی چومنے آتا ہے آج قدموں کو
جو میکدے سے ترے پی کے ہم نکلتے ہیں

روش روش ہے خیاباں قدم قدم ہے چمن
بہار بن کے گلستاں میں وہ نکلتے ہیں

ہے وہ مثال چراغ سحر مگر کچھ لوگ
نہ جانے کس لیے صہبا سے اب بھی جلتے ہیں

مجھے پھر یاد ماضی کی دلانے کون آتا ہے
پھر اک نشتر مرے دل پر لگانے کون آتا ہے
مری نظروں سے پھر نظریں ملانے کون آتا ہے
مجھے پھر اپنا دیوانہ بنانے کون آتا ہے
خزاں کی گود میں ملتا ہے لطفِ زندگی مجھ کو
نویدِ فصلِ گل لے کر ستانے کون آتا ہے
مرے ارماں بھرے دل کو خبر ہے سارے عالم کی
ذرا دیکھوں تو اب اس کو مٹانے کون آتا ہے
چمن میں دیکھ کر مجھ کو کہا کانٹوں نے یہ بڑھ کر
پھر ہم کو اپنے سینہ سے لگانے کون آتا ہے
لیے پہلو میں اپنے روشنی میرے مقدر کی
مری سوئی ہوئی قسمت جگانے کون آتا ہے
بھٹکتا دیکھ کر مجھ کو رہِ منزل میں اے صہبا
تصور بن کے اب رستہ دکھانے کون آتا ہے

اکتوبر ۵۶ء

نظر کھو گئی جب نظاروں کے پیچھے
وہ جلوہ نظر آیا تاروں کے پیچھے

کبھی رنگ لائیں گے آنسو ہمارے
کہ شعلے چھپے ہیں بہاروں کے پیچھے

سکوں ڈھونڈتے ہیں جو موجوں کے اندر
وہ جاتے نہیں ہیں کناروں کے پیچھے

نہ چھیڑے کوئی سازِ دل کو ہمارے
کہ دل سوز نغمے ہیں تاروں کے پیچھے

ہر اک مسکراہٹ کے پیچھے ہیں آنسو
خزاں جس طرح ہو بہاروں کے پیچھے

ستمبر ۵۷ء

بفیضِ عشق والفت پائی ہے ایسی نظر میں نے
نظر آیا ہے جلوہ یار کا دیکھا جدھر میں نے

چلا ہوں سوئے منزل تو پہنچ جاؤں گا منزل تک
تمھارے ہی تصوّر کو بنایا راہ بر میں نے

نہ اب آنکھوں میں آنسو ہیں نہ آہیں ہیں مرے لب پر
چھپا کر اپنے پہلو میں رکھا دردِ جگر میں نے

غم واندوہ کی دنیا میں لطفِ زندگی کیسا
خدا کا شکر، پائی ہے حیاتِ مختصر میں نے

جگہ مجکو ملی ہے سایۂ رحمت میں اے صہبا
یہ دیکھا نالۂ شب گیر میں اپنے اثر میں نے

نومبر ۵۷ء

وہی میرے دل کا مسکن وہی تیرا آشیانہ
جہاں دل نے چین پایا جہاں جھک گیا زمانہ

میں وہ راہ رو ہوں جس کا کوئی ہم سفر نہیں ہے
رہی آرزو کبھی تو مرا ساتھ دے زمانہ

انھیں چند آنسوؤں میں ہے نہاں مری کہانی
زرہِ کرم وہ سن لیں مرے درد کا فسانہ

میں ہزار جاں سے قرباں تری شانِ مغفرت کے
مجھے بخش دے الٰہی کوئی ڈھونڈ لے بہانہ

نومبر ۵۷ء

جب کبھی ان کی یاد آتی ہے
کچھ نئے گل کھلا کے جاتی ہے

شرم سے ان کی جھک گئیں نظریں
یا کوئی بات یاد آتی ہے

آشیاں سے تعلقِ خاطر
دیکھ کر برق مسکراتی ہے

چار دن کی ہے زندگی خود ہی
زندگی کس لیے رُلاتی ہے

کیا بتائیں نویدِ گل کیوں کر
خار بن کر کھٹکتی جاتی ہے

ستمبر ۵۷ء

تعجب کیا درِ ساقی پہ گر دربان بکتے ہیں
ذرا کچھ آگے بڑھ کر دیکھیے انسان بکتے ہیں

نہ جانا اطلس و دیبا کی پوشاکوں پہ دنیا میں
کہ بندے سیم و زر کے اس جگہ ہر آن بکتے ہیں

دکانوں پر بھی دیکھا اور دیکھا خانقاہوں میں
وہاں قرآن بکتے ہیں یہاں ایمان بکتے ہیں

اسی گردوں کے نیچے اور اسی ارضِ مقدس پر
کہیں انصاف بکتا ہے کہیں فرمان بکتے ہیں

نہیں ہے پاس جن کو عزت و ناموس کا صہبا
سرِ بازار آ کر وہ علی الاعلان بکتے ہیں

دسمبر ۵۷ء

ہے راز کا سینہ میں چھپانا مشکل
سینہ سے زباں پر اسے لانا مشکل
آسان ہے آسان کو آساں کہنا
پھیلائیں اگر ہاتھ تو پانا مشکل

کچھ رنج و مصیبت میں گذر جاتی ہے
کچھ فکرِ معیشت میں گذر جاتی ہے
اس خاک کے پتلے کا ہے دن رات یہ حال
معبود سے غفلت میں گذر جاتی ہے

۱۹۴۶ء

کبھی جب حسن کا پیغام آیا
مرے سر اک نیا الزام آیا
پہنچ کر ہی رہا منزل پہ اپنی
تصور ہی کسی کا کام آیا
کبھی بیتاب ہا نظروں سے اس کی
کبھی گردش میں دور جام آیا
وہ آخر خود ہی آئے پاس میرے
میرا ناکام ہونا کام آیا
نہیں معلوم کیا ہو حشر دل کا
زباں پر پھر کسی کا نام آیا
کھٹکتا ہے زمانے کی نظر میں
جو صہبا آپ کا خوش کام آیا

دسمبر ۵۷ء

مجھ کو گرا دیا تھا میرے اعتبار نے
لیکن دیا سہارا ترے اختیار نے

اس کو خزاں نے ہنس کے گلے سے لگا لیا
پالا تھا جس کو گود میں کل تک بہار نے

اک روز بھی سکون سے ہم رہ نہیں سکے
آئے تھے چند روز یہاں پر گذار نے

پھر ہو رہے ہیں زخم جگر کے مرے ہرے
چونکا دیا ہے مجھ کو نسیم بہار نے

صہبا تو مر چکا تھا یہاں جیتے جی مگر
زندہ رکھا ترے کرم بے شمار نے

فروری ۵۸ء

خلش کچھ قلب میں کم ہو رہی ہے
مجھے اب عادتِ غم ہو رہی ہے

خدا ہی جانے کیا ہو حال دل کا
کسی کی زلف برہم ہو رہی ہے

پسِ دیوار شاید کوئی ہو گا
مری آواز مدھم ہو رہی ہے

اندھیرا چھا رہا ہے چار جانب
ہر اک شئے اس میں مدغم ہو رہی ہے

ہے میری زندگی دو دن کی یارب
تو پھر کیوں صرفِ ماتم ہو رہی ہے

سرہانے کھڑے ہیں مسکراتے
یہ گویا پرسشِ غم ہو رہی ہے

کرو اب اپنی آنکھیں بند صہبا
کہ شمعِ زیست مدھم ہو رہی ہے

فروری ۵۸ء

نظروں سے مسکراتے نظارے چلے گئے
گویا کہ زندگی کے سہارے چلے گئے

وہ تھے کہ ان کو اپنے ستم ہی سے کام تھا
ہم تھے کہ ان کے ساتھ گذارے چلے گئے

یہ جانتے ہوئے بھی نہ آئیں گے پھر کبھی
ہم ان کو بار بار پکارے چلے گئے

اپنا رہا رفیق بس اک شوقِ انتظار
اک ایک کر کے سارے ستارے چلے گئے

طوفاں شناس جن کی طبیعت نہیں رہی
موجوں سے دور ان کے کنارے چلے گئے

صہبا غمِ حیات میں آنسو بھی خشک ہیں
تسکینِ دل کے یہ بھی سہارے چلے گئے

اکتوبر ۵۸ء

کوئی یہ بات کہہ دے ان سے جاکر
گلوں سے کھیلنا دامن بچا کر

مرے دل میں بھی ہیں کچھ طور پنہاں
نہ دیکھیں اس طرف وہ مسکرا کر

تمہارا غم ہی وجہ زندگی ہے
نہ کیوں رکھوں اسے دل سے لگا کر

غم ہستی تھا بارِ دوش لیکن
سکوں کچھ مل گیا آنسو بہا کر

ہنسانا تو انھیں آیا نہ صہبا
ملا کچھ چین ہنستوں کو رُلا کر

نومبر ۵۸ء

بہت ہی دور سے آیا ہوں چل کر
کہاں جاؤنگا محفل سے نکل کر

رہِ الفت کے کانٹے کہہ رہے ہیں
چلوں لیکن ذرا رک کر سنبھل کر

امڈ آتے ہیں اب آنکھوں سے آنسو
کہیں رسوا نہ کر دیں یہ نکل کر

رہے پاسِ ادب اے جذبۂ دل
یہ بزمِ ناز ہے رہنا سنبھل کر

زہے قسمت وہ میرے پاس آئے
انھیں میں دیکھتا ہوں آنکھ مل کر

تجھے کیا مل گیا اے برقِ مضطر
نشیمن کو ملی تسکین جل کر

یہ کیسا شور اٹھا اس کے گھر سے
چلو دیکھیں ذرا اصحبا کو چل کر

نومبر ۵۸ء

ہو گیا ہے اور ہی دُنیا کا رنگ
اب نہ پہلی سی رہی دل کی امنگ

میرا دنیا سے ہوا ہے جب سے سنگ
دیکھتا ہوں نت نیا ہر روز ڈھنگ

اب گذرتی ہے بڑے ہی لطف سے
وسوسوں سے روز ہی ہوتی ہے جنگ

ہر قدم پر کر رہا ہوں احتیاط
روز دنیا ہو رہی ہے شوخ و شنگ

وسعتیں اس کے کرم کی دیکھ کر
ہے نظر میں عرصۂ امکاں بھی تنگ

نومبر ۵۸ء

تیرے دیوانے ترے ہجر میں کیا کرتے ہیں
نام لیتے ہیں ترا اور دعا کرتے ہیں

ہم ترے واسطے کیا کیا نہ کیا کرتے ہیں
زہر کے گھونٹ بھی ہنس ہنس کے پیا کرتے ہیں

ان کو بھی آتی ہے رہ رہ کے ہنسی دنیا پر
تیرے دیوانوں پہ جب لوگ ہنسا کرتے ہیں

ساغر و جام و سبو دور کرو نظروں سے
ہم تو ساقی کی نگاہوں سے پیا کرتے ہیں

کوئی دیکھے تو وقارِ غمِ فرقت صہبا
بہنے دیتے نہیں اشکوں کو پیا کرتے ہیں

نومبر ۵۸ء

نقش بن کر ستم رہ گئے
یاد کرنے کو ہم رہ گئے

ان کے حصّے میں عیش و خوشی
میرے حصّہ میں غم رہ گئے

غیر تو مسکراتے رہے
لے کے ہم چشم نم رہ گئے

اُن کے اوروں پہ لطف و کرم
جور سہنے کو ہم رہ گئے

اب بھی اہلِ وفا ہیں بہت
کون کہتا ہے کم رہ گئے

چھوڑ کر ساتھی اکثر گئے
پیچھے رونے کو ہم رہ گئے

صبا یہ رُت یہ کالی گھٹا
اک ترسنے کو ہم رہ گئے

شدّتِ غم میں بھی اکثر مسکرا دیتا ہوں میں
آپ کی خاطر ہر اک غم کو بھلا دیتا ہوں میں

جب نظر آتا نہیں تسکین کا پہلو کوئی
اپنے سینہ میں امنگوں کو سُلا دیتا ہوں میں

جل نہ جائے آشیاں خود میری آہوں سے کہیں
برقِ مضطر آ بھی جا تجھکو صدا دیتا ہوں میں

لذّتِ غم دیکھ کر کیفِ الم پہچان کر
سوزِ دل کو اپنی آہوں سے ہوا دیتا ہوں میں

اقتضائے بندگی کہیئے کہ شانِ عاشقی
آپ کی مرضی کے آگے سر جھکا دیتا ہوں میں

کس قدر ہے اس میں لذّت کوئی کیا سمجھے اسے
اپنے بدخواہوں کے حق میں بھی دعا دیتا ہوں میں

نشّہ الفت بھی صہبا کیا کہوں کیا چیز ہے
بے خودی میں راز کی باتیں سنا دیتا ہوں میں

ہر پھول میں ہر غنچے میں نکہت اس کی
ہر شاخ میں ہر برگ میں رنگت اس کی
آنکھوں میں کہاں دید کی طاقت ورنہ
پنہاں ہے ہر اک چیز میں صورت اس کی

ہر وقت ہی آنکھوں میں نمی رہتی ہے
اک غم کی گھٹا دل پہ جمی رہتی ہے
نالہ مرا رک جاتا ہے لب پر جیسے
ساحل کے قریں موج تھمی رہتی ہے

سنہ ۱۹۴۶ء

اُن سے وعدہ کبھی وفا نہ ہوا
تو بھی مجھ کو کوئی گلہ نہ ہوا

ہم اسے عشقِ خام کہتے ہیں
درد بڑھ کر اگر دوا نہ ہوا

ایک غم ہی مرا رفیق رہا
کوئی غم خوار دوسرا نہ ہوا

لطفِ ہستی اسے نصیب کہاں
جس کا دل غم سے آشنا نہ ہوا

کٹ گئی رات باتوں باتوں میں
ماجرا ہو گیا گلہ نہ ہوا

کیا کہوں کون سا وہ لمحہ تھا
مجھ پہ جو صبر آزما نہ ہوا

بات کیا ہے کہ آپ سے صہبا
کوئی بھی آج تک بُرا نہ ہوا

جنوری ۵۹ء

اک شمعِ انتظار جلائے ہوئے ہیں ہم
لو اپنی بس اسی سے لگائے ہوئے ہیں ہم

کیا کچھ نہ دکھ جہاں کے اٹھائے ہوئے ہیں ہم
چھیڑو نہ ہم کو خود ہی ستائے ہوئے ہیں ہم

سمجھو ہمارے دل کو نہ اک ڈھیر راکھ کا
چنگاریاں کچھ اس میں دبائے ہوئے ہیں ہم

ہیں سرد و گرم دہر سے بے فکر و مطمئن
چوکھٹ پہ ان کی سر کو جھکائے ہوئے ہیں ہم

صہبا یہ جان کر وہ غفور الرحیم ہے
بارِ گناہ سر پہ اٹھائے ہوئے ہیں ہم

جنوری ۵۹ء

آنکھوں تک آج دل کے پیام آکے رہ گئے
ہم مسکرا کے اور وہ شرما کے رہ گئے

یہ بھی کرم ہے ہم پہ نویدِ بہار کا
دامن جو اپنا کانٹوں میں الجھا کے رہ گئے

طوفانیوں کے ساتھ رہا ساحلِ مُراد
منجدھار سے جو ڈر گئے گھبرا کے رہ گئے

بے چین کر دیا کہو کس کے خیال نے
گیسو کی طرح آپ جو بل کھا کے رہ گئے

کیا جانے کیا اثر ہے یہ صہبا کے نام میں
وہ اک ادائے خاص سے شرما کے رہ گئے

جنوری ۵۹ء

تصوّر میں کبھی تصویر تیری آ نہیں سکتی
نگاہِ شوق اپنی حد سے آگے جا نہیں سکتی
انھیں میں دیکھ لیتا ہوں وہ جس صورت میں بھی آئیں
نظر میری کسی صورت بھی دھوکا کھا نہیں سکتی
مجھے الجھا رکھا ہے شومیٔ قسمت نے کانٹوں سے
نویدِ فصلِ گل دل کو مرے بہلا نہیں سکتی
بلند و پست سے مانوس گرم و سرد سے واقف
اجل کی شورشوں سے زندگی گھبرا نہیں سکتی
نگاہِ ناز میں انگڑائیاں لینے شباب آیا
محبت کے تقاضوں کو وہ اب ٹھکرا نہیں سکتی
مجھے منظور ہے اس کی خوشی ہر حال میں صہبا
مرے لب پر کبھی اس کی شکایت آ نہیں سکتی

جنوری ۵۹ء

مجھ کو غمِ فراق میں جو اشک تر ملے
دامن میں اپنے بھر لیے جتنے گہر ملے

خود آگہی سے بڑھ کے نہ تھا کوئی راہبر
یوں تو قدم قدم پہ کئی راہبر ملے

مطلب شناس اہلِ غرض مار آستیں
کتنے مری حیات میں ایسے بشر ملے

وہ زندگی ہے جس میں رہے غم کی چاشنی
بے کیف ہے حیات بغیر اس کے گر ملے

خم ہے سرِ نیاز مشیّت کے سامنے
غم بھی مجھے قبول اگر عمر بھر ملے

کچھ اضطرابِ برق نے ایسا اثر کیا
تنکے بھی آشیاں کے ہمیں منتشر ملے

صہبا کسے سناتے بھلا داستانِ غم
جو لوگ بھی جہاں میں ملے نوحہ گر ملے

جنوری ۵۹ء

پھر کوئی تازہ خبر آئی گلستانوں سے
راستے پٹ گئے سب چاک گریبانوں سے

وہ نہیں جانتے کیا دل پہ گذر جاتی ہے
کھیلتے رہتے ہیں ہر وقت جو ارمانوں سے

میرے دامن کے ہر اک تار میں کانٹے الجھے
کچھ نہ کچھ مل ہی گیا مجھ کو گلستانوں سے

پھول بننا تو کجا غنچے چٹک بھی نہ سکے
اس طرح گذری بہار اب کے گلستانوں سے

پھر پریشاں نہ کرو کر کے پریشاں زلفیں
کیا ملے گا تمھیں ہم جیسے پریشانوں سے

ہیم امواج نہیں خوف تلاطم بھی نہیں
ڈوب کر ہم تو نکل آئیں گے طوفانوں سے

ہم تو پی لیتے ہیں نظروں سے کسی کی صہبا
واسطہ جام سے ہے اپنا نہ پیمانوں سے

مئی ۵۹ء

تیری دل داری بھی اے برقِ تپاں ہے سامنے
فطرتاً کچھ کچھ خیالِ آشیاں ہے سامنے

جب کبھی بھی آگیا ہے جبہہ سائی کا خیال
میں نے یہ دیکھا کہ تیرا آستاں ہے سامنے

ہم پہنچ کر ہی رہیں گے منزلِ مقصود پر
جانتے ہیں ہر قدم پر امتحاں ہے سامنے

جب چلا چھٹ کر قفس سے میں نشیمن کی طرف
دیکھتا کیا ہوں کہ جلتا آشیاں ہے سامنے

لوگ خوش تھے دیکھ کر رنگِ بہارِ گلستاں
رو دیئے ہم اس طرح جیسے خزاں ہے سامنے

نام اپنا پھر سرِ فہرست آتا ہے نظر
ہر کرم ان کا بہ شکلِ امتحاں ہے سامنے

باغ میں صہبا ہے بے جا امتیازِ رنگ و بو
حیف گلچیں پر کہ فرقِ این و آں ہے سامنے

جون ۵۹ء

تمہاری یاد سے پھر دل نے روشنی پائی
پھر ایک بار مقدّر نے لی ہے انگڑائی

اُدھر جو برق نشیمن پہ میرے لہرائی
ادھر ہنسی مرے ہونٹوں پہ یک بہ یک آئی

تری صدا میرے کانوں میں گونجتی ہے یوں
کہ جیسے دور کہیں بج رہی ہو شہنائی

دعا کے وقت جو آنکھوں سے گر گئے آنسو
ہوا یقین دعا کی ہوئی پذیرائی

وہ دے رہے ہیں نوید بہار کب صہبا
خزاں سے ہونے لگی جب مجھے شناسائی

جولائی ۵۹ء

تیرے کوچہ سے جب بھی ہم گذرے
سر جھکائے بہ ہر قدم گذرے

زندگی کو سکون جن سے ملا
ایسے لمحے بہت ہی کم گذرے

تجھے بہت صبر آزما اے دوست
راستے کے جو پیچ و خم گذرے

کیوں نہ ان کا اسے کرم سمجھوں
وہ جو ڈھاتے ہوئے ستم گذرے

ہم تو ملتے ہوئے کفِ افسوس
اس جہاں سے بہ چشمِ نم گذرے

اس کی مرضی کو بھانپ کر صہبا
لے کے پہلو میں اس کا غم گذرے

جولائی ۵۹ء

کسی کی یاد مجھے جب کبھی بھی آئی ہے
سرور و کیف کی دُنیا بھی ساتھ لائی ہے

کہی تھی آپ نے جو بات آنکھوں آنکھوں میں
وہ بات آج ہر اک کی زباں پر آئی ہے

کہاں زبان میں یارا ہے شرحِ کیفیت
جو آستاں پہ ترے لطف جبہ سائی ہے

گلوں کے شبنمی اشکوں نے کہہ دیا اتنا
خزاں کی گود میں پل کر بہار آئی ہے

وہی ادا مجھے محبوب ہو گئی ہے آج
زمانہ جس کو سمجھتا ہے کج ادائی ہے

ہزار بار چھپا وہ ہزار پردوں میں
مری نظر اسے ہر بار ڈھونڈ آئی ہے

جبینِ یار پہ صہبا جو تھی شکن کل تک
وہی نوشتۂ تقدیر بن کے آئی ہے

آنسو جو کبھی آنکھ سے گر جاتے ہیں
طوفاں گویا دل میں اُمڈ آتے ہیں
سوئے ہوئے نغموں کو نہ چھیڑ اے ہمدم
سونے دے انھیں نیند کے یہ ماتے ہیں

جاری ہے کہیں مسئلہ خیر و شر
ہوتا ہے کہیں تذکرۂ جبر و قدر
یہ باتیں نہیں بحث کی ہرگز صہبا
انساں کے لیے خامشی سب سے بہتر

سنہ ۱۹۴۶ء

کیا ڈرائیں گے یہ رستے کے نشیب اور فراز
اب نظر میں مری منزل کے سوا کچھ بھی نہیں

آئیں گر بام پہ وہ زلف پریشاں لے کر
کہہ اٹھے ساری فضا کالی گھٹا کچھ بھی نہیں

درد بھی دے تو اسے تیرا کرم ہی سمجھوں
میری مرضی تری مرضی کے سوا کچھ بھی نہیں

پاؤں میں لنگ، زباں گنگ نظر پر بندش
مختصر یہ ہے کہ جینے میں مزا کچھ بھی نہیں

سانس کی آمد و شد سے بھی پتہ چلتا ہے
زندگی آہِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

بجلیو آؤ نشیمن میں چھپے ہیں ارماں
کون کہتا ہے کہ تنکوں کے سوا کچھ بھی نہیں

کہہ رہے ہیں دمِ آخر سرِ بالیں آ کر
چال ہے مکر ہے صہبا کو ہوا کچھ بھی نہیں

یہ پاسِ محبت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے
کچھ اپنی طبیعت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے

سب اس کی نوازش ہے کرم لطف و عطا ہے
وہ درد میں لذت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے

ہر پھول فسردہ ہے ہر اک غنچہ ہے خاموش
گلشن کی یہ حالت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے

یہ دھوپ یہ چھاؤں یہ شب و روز کا نقشہ
آئینۂ قدرت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے

سب کچھ وہ روا رکھتے ہیں مجبور سمجھ کر
یہ اپنی طبیعت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے

یہ اشک مسرت کے ہیں یا غم کے ہیں صہبا
اک رازِ محبت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے

شرمندہ حجابات ہیں معلوم نہیں کیوں
در پردہ کنایات ہیں معلوم نہیں کیوں

سورج بھی وہی چاند ستارے بھی وہی ہیں
بدلے ہوئے دن رات ہیں معلوم نہیں کیوں

آجاؤ کہ یہ قلب و جگر اور یہ آنکھیں
مشتاقِ ملاقات ہیں معلوم نہیں کیوں

نے سازِ محبت ہے نہ سوزِ غمِ فرقت
بے کیف سے نغمات ہیں معلوم نہیں کیوں

صہبا جو نظر آتے تھے مسرور ہمیشہ
وقفِ غمِ صدمات ہیں معلوم نہیں کیوں

اکتوبر ۵۹ء

نظر کیوں کر نہ آئے اس میں جلوہ نور یزداں کا
خدا خود جس میں ہوتا ہے مکیں وہ دل ہے انساں کا

یہ کیسی فصلِ گل کوئی کلی چٹکی نہ گل مہکا
خدا جانے خزاں میں حال کیا ہوگا گلستاں کا

پریشاں جس سے ہو جاتے ہیں دل بھی اور نظریں بھی
وہ عالم اور عالم ہے تری زلفِ پریشاں کا

رخِ زیبا کا جس دم بھی تصور مجھکو آتا ہے
سمجھ لیتا ہوں مجھکو مل رہا ہے درس قرآں کا

نئے انداز سے صہبا سنا ہے فصل گل آئی
خدا حافظ ہے دل کا اور اپنے جیب و داماں کا

نومبر ۵۹ء

بہاروں کی نظر پڑنے لگی ہے پھر گلستاں پر
نہیں معلوم کیا بن آئے گی جیب و گریباں پر

نویدِ فصلِ گل ہے اور کوئی گل نہیں مہکا
اداسی چھا گئی ہے کس لیے سارے گلستاں پر

کہیں ایسا نہ ہو آیا ہو کوئی اور دیوانہ
یہ کیسی آ گئی رونق در و دیوارِ زنداں پر

کوئی دیکھے تو ضبطِ غم ذرا پاسِ محبت میں
مچل کر رہ گئے ہیں اشک میرے نوکِ مژگاں پر

سکوں ساحل کا صہبا اہلِ ساحل کو مبارک ہو
ملا ہے لطف کچھ جینے کا ہم کو دوشِ طوفاں پر

نومبر ۵۹ء

آنسوؤں نے دکھائے ہمارے
شامِ غمگیں کے اکثر نظارے

میں نے مانا ہیں دلکش کنارے
کب بنے یہ کسی کے سہارے

پھنس گیا ہے کوئی جب بھنور میں
دیکھتے رہ گئے ہیں کنارے

بجلیو آشیاں ہے ادھورا
کس لیے ہیں ابھی سے اشارے

ان کو آنا نہ تھا وہ نہ آئے
چھپ گئے آسماں پر ستارے

کیا خبر اُن کو، آتے ہی اُن کے
کیا گذرتی ہے دل پر ہمارے

ہم سے طوفاں شناسوں کو صہبا
کیا ڈرائیں گے یہ تیز دھارے

نومبر ۵۹ء

دھواں اٹھنے لگا کیوں آشیاں سے
سبب پوچھے کوئی برقِ تپاں سے
جو سر جھکتا نہ تھا در پر کسی کے
وہ سر اٹھتا نہیں اب آستاں سے
کبھی امرت کبھی ہے تیر و نشتر
جو چاہو کام لو اپنی زباں سے
نوازش ہے، عنایت ہے، کرم ہے
جو پوچھو حالِ دل اپنی زباں سے
جسے جنت نشاں کہتی ہے دنیا
مجھے نسبت ہے اس ہندوستاں سے
ہماری داستانِ غم بھی صہبا
بہت ملتی ہے تیری داستاں سے

دسمبر ۵۹ء

سینہ میں جب چراغ محبت کے جل گئے
ہم تیرے اختیار کے سانچے میں ڈھل گئے

ہر شے اداس اداس سی آتی ہے کیوں نظر
نظریں بدل گئی ہیں کہ منظر بدل گئے

کس طرح اُن سے کہتے شبِ غم کا ماجرا
عنوانِ غم کے ساتھ ہی تیور بدل گئے

منزل پکارتی ہی رہی ہم کو بار بار
ہم انتہائے شوق میں آگے نکل گئے

دو دن کی زندگی میں کوئی ہم سے پوچھ لے
پہلوئے غم حیات کے کتنے بدل گئے

جائیں کہاں نہ میکدہ اپنا نہ اپنے رند
جام و سبو بدل گئے ساغر بدل گئے

اُن کی نظر کے پھرتے ہی صہبا نہ جانے کیوں
دیکھا یہی زمانے کے تیور بدل گئے

دسمبر ۵۹ء

ہر سُرور کیف آیا ایک دنیائے خوشی آئی
جو تم آئے مرے نزدیک میری زندگی آئی

کہیں بھولے سے بھی مجھ تک اگر کوئی خوشی آئی
نہیں معلوم کیا تھا یک بہ یک مجھ کو ہنسی آئی

تری راہِ محبت کا میں اک ایسا مسافر ہوں
مجھے آواز دیتے ڈھونڈتے خود آگہی آئی

تری شانِ کریمی کے میں دل سے جان سے قرباں
کہ روزِ حشر مجھکو مغفرت بھی ڈھونڈتی آئی

میں ہوتا جا رہا ہوں دور تر اس سے مگر صہبا
یہ دیکھا میں نے میرے پیچھے پیچھے زندگی آئی

دسمبر ۵۹ء

برق کی پھر نظر نہ ہو جائے
تنکا تنکا شرر نہ ہو جائے

ضبطِ غم! آنسوؤں کا شیرازہ
دیکھنا منتشر نہ ہو جائے

زندگی ہے میری جفاؤں پر
ان کو اس کی خبر نہ ہو جائے

آدمی آدمی نہیں رہتا
خوگرِ غم اگر نہ ہو جائے

وہ اٹھانے لگے ستم سے ہاتھ
زندگی مختصر نہ ہو جائے

میرے مالک کہیں ترا صہبا
دیکھنا دربدر نہ ہو جائے

جنوری ۱۹۶۰ء

باطن نے ہمیشہ ہی ڈرایا مجھ کو
ظاہر نے بہر طور چھپایا مجھ کو
بخشش کا کسی حال سزاوار نہ تھا
رحمت نے مگر تیری بچایا مجھ کو

اس دہر میں معلوم ہے اپنا انجام
بھولے سے بھی لے گا نہ کوئی اپنا نام
دھوکے ہیں یہ سب جتنے ہیں جینے جی کے
مے اپنی سبو اپنا نہ ہے اپنا جام

۱۹۴۸ء

نہ پوچھو کچھ حال میری کشتی کا دوشِ طوفاں پہ چل رہی ہے
کبھی بھنور میں گھری ہوئی ہے کبھی بھنور سے نکل رہی ہے

کبھی نظر ہے بلندیوں پر کبھی چھپا ہوں میں پستیوں میں
میں کیا بتاؤں کہ زندگی میری کیسے سانچے میں ڈھل رہی ہے

خیال بن کر جو چٹکیاں لے رہے تھے قلب و جگر میں میرے
سرور بن کر وہ چھا رہے ہیں حیات کروٹ بدل رہی ہے

فریبِ منزل وہ دے رہے ہیں میں ان کے دھوکے میں آ رہا ہوں
خوشی نہ کیوں کر ہو اس کی مجھ کو کہ ان کی حسرت نکل رہی ہے

یہ مجھ سے ہر بار اور ہر دم سکون دل کہہ رہا ہے صہبا
پہنچ رہی ہے درِ اثر تک دعا جو دل سے نکل رہی ہے

جنوری سنہ ۶۰ء

کام آخر آگئی نسبت جو ان کے در سے ہے
نام اونچا ہوگیا اپنا کسی کے نام سے

جب نظر آتے ہیں رنج و غم خوشی کے ساتھ ساتھ
زندگی کیوں کر نہ گھبرائے خوشی کے نام سے

جب نہ تھا انسان تھی بے نور یہ دنیا تمام
قصۂ ہستی ہے رنگیں آدمی کے نام سے

ہاں اسی گردوں کے نیچے کیا بتاؤں کیا ہوا
دشمنی اکثر ہوئی ہے دوستی کے نام سے

میں بنائے جا رہا ہوں آشیاں پر آشیاں
برق گرتی جا رہی ہے روشنی کے نام سے

سانس کی ہر آمد و شد میں ہے اس کا نام اب
زندگی منسوب ہے اپنی اسی کے نام سے

پاس تھا عہدِ ازل کا ہر گھڑی صہبا مجھے
جی بہت گھبرایا ورنہ زندگی کے نام سے

فروری ۱۹۶۰ء

اشک پیتے رہے مسکراتے رہے
اپنے غم کو ہمیشہ چھپاتے رہے
جان کر ہم ہیں تیرے یہ ارض و سما
ہر قدم پر ہمیں آزماتے رہے
ایک وہ جس نے ہم کو نہ اپنا کہا
ایک ہم اس کو اپنا بتاتے رہے
ایک ہم تھے کہ بنتے رہے خاک رہ
ایک وہ تھے کہ دامن بچاتے رہے
چاہنے والے بس کر سکے اس قدر
غم کو سینے سے اپنے لگاتے رہے
اس طرف بجلیاں تھیں کہ ہنستی رہیں
اس طرف ہم نشیمن بناتے رہے
رکھ کے سینہ میں اپنے دلِ غم زدہ
ساری دنیا کو صہبا ہنساتے رہے

فروری ۶۰ء

ہر آرزو جو سینہ میں میرے مچل گئی
اشکوں کی شکل آنکھوں میں آکر نکل گئی

ارمان بن کے آنکھوں میں آنسو مچل گئے
آئی قضا تو حسرتِ دل بھی نکل گئی

محرومِ التفات کی دُنیا بدل گئی
وہ دل میں جب سما گئے حسرت نکل گئی

ابھرے نہ تھے کہ گھر گئے طوفاں میں یک بہ یک
یوں دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی

کیا کہئے کیا اثر ہے نہاں ذکرِ یار میں
لیتے ہی اس کا نام طبیعت سنبھل گئی

دیوار و در خلاف ہیں شام و سحر خلاف
وہ کیا بدل گئے ہیں کہ دنیا بدل گئی

فروری سنہ ۶۰ء

ہے میری زباں پر جو ترا نام ابھی تک
دیتی ہے یہ دُنیا مجھے دشنام ابھی تک

میں ہو نہ سکا عشق میں خوش کام ابھی تک
لیتا ہے میرے دل میں غم آرام ابھی تک

ہو چشمِ عنایت تری اک بار ادھر بھی
بیٹھے ہیں تیرے در پہ تہی جام ابھی تک

اک بار چمک اٹھے تھے آنکھوں میں ستارے
ہیں اس کے لیے مورد الزام ابھی تک

گردش میں جو صہبا کے ستارے نظر آئے
بے چین سی ہے گردشِ ایام ابھی تک

مارچ سنہ ۶۰ء

چھپی ہیں رفعتیں جو اس کے آستانے میں
نظر نہ آئیں مجھے وہ کہیں زمانے میں
کسی کی یاد مرے دل میں اس طرح آئی
کہ جیسے آتا ہو کوئی غریب خانے میں
بجھی بجھی سی فقط چند حسرتوں کے سوا
ملے گا کچھ نہ تجھے برق آشیانے میں
یہ آپ سوچ لیں روداد سن سکیں گے بھی
مجھے تو کچھ بھی تامّل نہیں سنانے میں
کہاں نصیب کہ ہم لوٹتے بہار چمن
اک عمر بیتی ہے دامن یہاں چھڑانے میں
رہے خیال کہ ویراں نہ ہو دلِ صہبا
تمھیں کو دیر لگے گی اسے بسانے میں

اپریل ۱۹۶۰ء

صبح سے ربط نہ اب شام سے دلچسپی ہے
مجھ کو آغاز نہ انجام سے دلچسپی ہے

رنج سے درد سے آلام سے دلچسپی ہے
اب مجھے گردشِ ایّام سے دلچسپی ہے

آشکارا مرے سجدوں کی تڑپ سے یہ ہوا
اس کو بھی بندۂ بے دام سے دلچسپی ہے

گامزن جب سے ہوا ہوں میں طلب میں اس کی
مجکو ہر گام پہ ہر گام سے دلچسپی ہے

میں تو پی لیتا ہوں نظروں سے کسی کی صہبا
میکدے سے نہ مجھے جام سے دلچسپی ہے

اپریل سنہ ۶۰ء

عاشقی آزار ہو کر رہ گئی
زندگی دشوار ہو کر رہ گئی

جب کسی سے چار آنکھیں ہو گئیں
کچھ نہ کچھ گفتار ہو کر رہ گئی

کام اتنا کر گئی ان کی نظر
میرے دل کے پار ہو کر رہ گئی

شور اٹھا بعد مرنے کے مرے
سعیِ غم بیکار ہو کر رہ گئی

جب سے صہبا وہ گئے ہیں باغ سے
ہر کلی اک خار ہو کر رہ گئی

مئی ۱۹۶۰ء

ہم سے قائم قلب و دل ہیں اور قلب و دل سے ہم
آپ کی رونق ہے ہم سے آپ کی محفل سے ہم
آپ غم کے دینے والے آپ جانیں انتہا
آشنا کس طرح ہوں گے درد کی منزل سے ہم
ایک منزل رہ گئی بن کر غبارِ کارواں
ہو رہے ہیں آشنا اک اور ہی منزل سے ہم
شورشِ طوفاں میں لطفِ زندگی آنے لگا
جیسے جیسے دور تر ہوتے گئے ساحل سے ہم
بڑھ رہا ہے کاروانِ زندگی کچھ اس طرح
دور جیسے ہو رہے ہیں ہر قدم منزل سے ہم
راستوں کے پیچ و خم تو آ گئے پیروں تلے
اب نہیں ڈرنے کے صہبا دوریٔ منزل سے ہم

اگست ۱۹۶۰ء

پھر اب آنسو مچلتے جا رہے ہیں
دیے الفت کے جلتے جا رہے ہیں

اُدھر آنسو رواں ہیں شمع کے بھی
ادھر پروانے جلتے جا رہے ہیں

یہ مانا سب کی منزل ایک ہی ہے
مگر رستے بدلتے جا رہے ہیں

خدا ہی جانے کیا ہو حال دل کا
ستم پہلو بدلتے جا رہے ہیں

سہارے میں تقدّس ہی کے صہبا
گنہ دن رات پلتے جا رہے ہیں

۱۶ اگست سنہ ۶۰ء

آنسو کبھی چپکے سے بھی پی لیتے ہیں
کانٹوں سے گریباں کبھی سی لیتے ہیں
پوچھیں وہ اگر حال تو کہہ دو صہبا
موہوم سی اُمید پہ جی لیتے ہیں

آنکھوں میں بس اک دھیان تمہارا لے کر
پہلو میں محبت کا شرارا لے کر
پھیرو نہ مجھے در سے تم اپنے خالی
آیا ہوں محبت کا سہارا لے کر

۱۹۴۸ء

حرفِ شکوہ ہم زباں پر اپنی لا سکتے نہیں
اشک پی لیتے ہیں آنکھوں سے گرا سکتے نہیں

شمعیں روشن ہیں شبستانوں کی جب تک دیکھنا
چھوڑ کر پروانے اپنی بزم جا سکتے نہیں

راستوں کے پیچ و خم جب تک نہ ہوں زیرِ قدم
منزلِ مقصود کو ہم اپنی پا سکتے نہیں

خواہ کھٹکیں خار یا دامن الجھتا ہی رہے
چھوڑ کر ہم گلستاں کو اپنے جا سکتے نہیں

گریوں ہی روتے رہے صہبا غمِ حالات پر
دیکھ لینا عمر بھر تم مسکرا سکتے نہیں

۱۰ اگست ۶۰ء

تصوّر میں وہ میرے دل کو بہلانے بھی آئیں گے
تمناؤں میں اپنی مجکو الجھانے بھی آئیں گے

نظر بہکی پریشاں دل تو لغزش پاؤں میں ہو گی
اسی انداز سے محفل میں دیوانے بھی آئیں گے

جہاں پر صبح دم شبنم گلوں کا منہ دُھلاتی ہے
وہاں صیاد اپنا دام پھیلانے بھی آئیں گے

جہاں ساقی صراحی جام و مینا ہوں گے اے صہبا
وہیں تم دیکھنا گردش میں پیمانے بھی آئیں گے

اگست سنہ ۶۰ء

وہ یوں آ گئے رخ پہ گیسو بکھیرے
اجالوں پہ چھا جائیں جیسے اندھیرے

گئے جب وہ نزدیک سے منہ اندھیرے
رہے دیکھتے آنکھ مل کر سویرے

ستارے کہوں ظلمت شب کے ان کو
جو فرقت نے آنکھوں میں موتی بکھیرے

یہ دل جس کو دنیا سمجھتی ہے میرا
غضب ہے کہ وہ بھی ہے قابو میں تیرے

سناتی ہے دنیا جنھیں اپنا کہہ کر
حقیقت میں صہبا وہ قصے ہیں تیرے

اگست ۶۰ء

چلے تیرے دیوانے گھر سے نکل کے
دہلنے لگے سینے دشت و جبل کے
مرے غم کے قصّے تھے جتنے بھی کل کے
زمانہ سناتا ہے عنواں بدل کے
اِدھر نبض ڈوبی تو بیمار تڑپا
اُدھر مسکراہٹ لبوں پر اجل کے
پریشاں پریشاں ابھی بجلیاں ہیں
ہوا اک زمانہ نشیمن کو جل کے
جو تم آ گئے زندگی مسکرائی
اجل رہ گئی دیکھتے ہاتھ مل کے
خبر ان کے آنے کی پھیلی فضا میں
پریشاں نظر آ رہے ہیں دھندلکے
بہت دن سے اصرار ہے ان کا صہبا
سناؤں میں اشعار اپنی غزل کے

اگست سنہ ۶۰ء

جب کوئی ساعت خوشی کی آگئی
زندگانی یک بہ یک گھبرا گئی

مسکرا کر آپ نے دیکھا مجھے
برق سی دل پر مرے لہرا گئی

کاوشِ مژگاں کا احساں کیا کہوں
میری ہر گتھی کو جو الجھا گئی

لوگ افسانہ اسے کہنے لگے
جب زباں پر بات دل کی آگئی

ڈگمگا جائیں جہاں صہبا قدم
بس یہ سمجھو پاس منزل آگئی

اگست ۶۰ء

کبھی اک سرور بن کر مری زندگی پہ چھائے
کبھی دل کی دھڑکنوں میں وہ مرے قریب آئے
کبھی اشک بن کے آئے کبھی درد بن کے آئے
مرے پاس جب بھی آئے وہ سرور و کیف لائے
انھیں بھولنے کی مجھ سے ہوئی جس قدر بھی کوشش
وہ خیال بن کے دل میں مرے بار بار آئے
وہی برق پھر ہے رقصاں تری مسکراہٹوں میں
ابھی چار دن نہ گذرے مرا آشیاں جلائے
ہوئیں چار ان سے آنکھیں تو گماں ہوا یہ مجھ کو
میں قریب ان کے پہنچا وہ مرے قریب آئے
یہی مرکزِ تخیل ہے ہمیشہ اپنا صہبا
کوئی تار آنسوؤں کا کہیں ٹوٹنے نہ پائے

دسمبر ۶۰ء

جو بھی تری صورت کا شیدا نظر آتا ہے
وہ راہ محبت میں تنہا نظر آتا ہے

ہر صبح پریشانی ہر شام ہراسانی
مشکل مجھے دنیا میں جینا نظر آتا ہے

مانوس ہوا جب سے اے فصل خزاں تجھ سے
ہر پھول بھی نظروں میں کانٹا نظر آتا ہے

یہ چاند ہے بادل میں یا نور ہے ظلمت میں
یا زلف کی چلمن میں چہرا نظر آتا ہے

مینا ہو صراحی ہو صہبا ہو کہ ساغر ہو
محفل میں جسے دیکھو ان کا نظر آتا ہے

پیشانی پہ آتی ہے جب اُن کی شکن صہبا
کانٹوں میں مجھے دامن الجھا نظر آتا ہے

ستمبر ۶۰ء

نام ہم آپ کا لے لے کے کہاں تک پہنچے
خود کو جب بھول گئے کون و مکاں تک پہنچے

زندگی بھر وہ رہے ڈھونڈتے سمت کعبہ
ہم چلے کعبہ سے اور کوئے بتاں تک پہنچے

زندگی کامری لے دے کے سہارا ہے یہی
کاش یہ بات مری جور بتاں تک پہنچے

جو گئے در سے ترے وہ تو کہیں کے نہ رہے
نفع سے دور ہوئے اور زیاں تک پہنچے

دور تر ہو گئے منزل سے سنبھل کر جو چلے
لڑکھڑاتے جو چلے تیرے نشاں تک پہنچے

ہم سے پوچھے کوئی روداد چمن اے صہبا
ہم بہاروں میں پلے اور خزاں تک پہنچے

ستمبر ۶۰ء

خوشی اس کی ہے مجھ کو غم نہیں ہے
کہ اب احساس کیف و کم نہیں ہے
غم امروز کا ماتم کریں کیا
غم فردا ابھی جب کچھ کم نہیں ہے
وہ ہو گا غیر کا یا آپ کا دل
کہ جس دل میں کسی کا غم نہیں ہے
کلی خاموش ہے گل آب دیدہ
چمن میں کوئی بھی خرم نہیں ہے
مرے غم کو بھلا وہ کیسے سمجھے
جو رازِ درد کا محرم نہیں ہے
مداوا دردِ دل کا غیر ممکن
نظر کے زخم کا مرہم نہیں ہے
وہ دنیا اور دنیا ہو گی صہبا
جہاں پر عیش ہے اور غم نہیں ہے

آنکھ میں اشکوں کو رقصاں کس سے دیکھا جائے گا
رخ پہ زلفوں کو پریشاں کس سے دیکھا جائے گا

فصلِ گل آئی کلی چٹکی نہ مہکا گل کوئی
ہائے یہ حالِ گلستاں کس سے دیکھا جائے گا

سایۂ گل میں جسے دیکھا تھا ہم نے بھی کبھی
اس کا اب چاکِ گریباں کس سے دیکھا جائے گا

اب نہ اہلِ دل ہیں باقی اور نہ وہ صاحب نظر
اب ہمارا دردِ پنہاں کس سے دیکھا جائے گا

ہم بھی ملتے تھے کبھی صہبا سے وہ دن اور تھے
اس کا اب حالِ پریشاں کس سے دیکھا جائے گا

ستمبر ۱۹۶۰ء

وہ زہر پلائیں بھی تو پی لوں ہنس کر
کانٹوں سے گریبان بھی سی لوں ہنس کر
تیری یہی مرضی ہے تو اے بارِ الٰہ
تا عمر اسی حال میں جی لوں ہنس کر

کچھ جھینپتے کچھ ہنستے ہنساتے آئے
منہ ہاتھوں سے وہ اپنا چھپاتے آئے
وہ زلف سیہ اور وہ آنچل کی بہار
نظروں سے دو عالم کو گراتے آئے

۱۹۴۹ء

زندگی بھر مجھ کو اس کا غم رہا
آپ میں احساسِ بیش و کم رہا

دیکھ کر الجھی ہوئی ہے زلفِ یار
کچھ مزاجِ دہر بھی برہم رہا

جب چلے اٹھ کر وہ بزمِ ناز سے
ساتھ میرا دیدۂ پرنم رہا

مل گیا سب کچھ سفالی جام سے
اور بہت بے فیض جامِ جم رہا

ساری دنیا جانتی ہے برق کا
آشیاں سے ربط مستحکم رہا

ہے یہی رودادِ دل صہبا مری
التفاتِ چشمِ ساقی کم رہا

ستمبر ۶۰ء

اس طرف ان کی عنایات نے کروٹ لی ہے
اس طرف میری شکایات نے کروٹ لی ہے

عشوہ و ناز و ادا کیفیتِ حسن و جمال
سچ تو یہ ہے تری ہر بات نے کروٹ لی ہے

میں یہ کہتا ہوں کہ الفاظ نے جامہ بدلا
لوگ کہتے ہیں روایات نے کروٹ لی ہے

وہی گلچیں وہی گلشن وہی صیّاد وہی دام
کون کہتا ہے کہ حالات نے کروٹ لی ہے

دن میں آرام نہیں چین نہیں راتوں میں
جب سے صہبا مرے دن رات نے کروٹ لی ہے

نظر کو تابشِ برق و شرار دی میں نے
تو دل کو دولتِ صبر و قرار دی میں نے

نئی نہیں ہیں ترے انتظار کی گھڑیاں
تمام عمر اسی میں گذار دی میں نے

بہ فیضِ عشق ہرے کر کے اپنے زخمِ جگر
نویدِ آمدِ فصلِ بہار دی میں نے

تمہارے رخ پہ جو گیسو کبھی بکھر آئے
نظر کو صحبتِ لیل و نہار دی میں نے

فروغِ حسن کی خاطر سے کم نگاہوں کو
نگاہِ شوق کبھی مستعار دی میں نے

کسی کے در سے تعلق سا اک عطا کر کے
جبیں کو دولتِ صد افتخار دی میں نے

کسی کے فیضِ محبت کا ہے اثر صہبا
جو آج کاکل گیتی سنوار دی میں نے

اکتوبر ۶۰ء

ہم ترے غم کو ہر اک غم سے سوا کہتے ہیں
حد سے بڑھ جائے تو غم ہی کو دوا کہتے ہیں

بے رخی کو تری سب لوگ جفا کہتے ہیں
ہم مگر اس کو بھی اک طرزِ ادا کہتے ہیں

ہم بُرے ہو گئے جو ان کو بھلا کہتے ہیں
وہی اچھے رہے جو اُن کو بُرا کہتے ہیں

آپ آتے ہیں تو مل جاتا ہے پیغامِ حیات
آپ کے جانے کو ہنگامِ قضا کہتے ہیں

ایسی دنیا میں جہاں غم کے سوا کچھ بھی نہیں
کیا کروں لے کے جسے آپ بقا کہتے ہیں

جو نظر آتے ہیں صد پیکرِ حسنِ خورشید
ایسے ذرّوں ہی کو خورشید نما کہتے ہیں

کرمِ گردشِ ایّام رہے گا کب تک
مجھ پہ ناکامی کا الزام رہے گا کب تک
تیرے وعدوں سے ذرا آ تو گیا دل کو قرار
دیکھنا ہے کہ یہ آرام رہے گا کب تک
بدلی بدلی نظر آتی ہے نگاہِ ساقی
دیکھیے دور میں اب جام رہے گا کب تک
آشیاں جتنے بنے نذر ہوے بجلی کے
مجھ پہ یہ لطف یہ انعام رہے گا کب تک
نام فانی بھی ہو کیوں دارِ فنا میں باقی
مٹنے والے کا یہاں نام رہے گا کب تک
اس پہ بھی چشمِ کرمِ پیرِ خرابات کبھی
آپ کا صہبا ہی جام رہے گا کب تک

نومبر ۶۰ء

دل ہی دل میں تجھے اے یار پکاریں کب تک
ہجر میں تیرے ہم اس طرح گذاریں کب تک

ادھ کھلی کلیاں ہیں اور پھول ہیں مرجھائے ہوئے
اس طرح آئیں گی گلشن میں بہاریں کب تک

یادِ پیہم سے تری لے کے خیالِ رنگیں
کنجِ تنہائی کو ہم اپنی سنواریں کب تک

آ بھی جا ہجر کی گھڑیاں ہیں کٹھن جانِ بہار
لوحِ دل پر تری تصویر اتاریں کب تک

نیم جاں حسرتیں پامال امیدیں تا کے
اور صہبا انھیں رو رو کے پکاریں کب تک

بھلائے سے بھی بھلائی نہ جائیں گی دل سے
جو اُن کی بزم میں گھڑیاں گذار آئے ہیں
جنوں بدوش تعاجب زندگی کا ہر لمحہ
کچھ اس طرح کے بھی لیل و نہار آئے ہیں
وہ کاش آتے نکل کر حدِ تعیّن سے
مرے خیال میں جو بار بار آئے ہیں
نوازشِ نگہِ یار کیا کہوں ہمدم
ہم ان کے در سے بصد افتخار آئے ہیں
جنوں کی خیر ہو ہوش و خرد خدا حافظ
وہ لے کے ساتھ نویدِ بہار آئے ہیں
بڑے مزے سے گذرتی ہے اپنی اب صہبا
جو دے کہ دل پہ انھیں اختیار آئے ہیں

ان کی محفل سے آئے ہم ہو کے
کیا کہیں کیا ملا ہے کیا کھو کے

جب تری یاد نے ستایا ہے
ہم نے تسکین پائی ہے رو کے

کیا کہوں حالِ گلشنِ ہستی
ہر قدم تھے بہار کے دھوکے

تارے گن کر گذاری کچھ شبِ ہجر
اور کچھ آنسوؤں سے منہ دھو کے

مسکراتی ہوئی نگاہوں نے
ہر قدم پر ہمیں دیے دھوکے

یہ مقامِ خوشی نہیں صہبا
تم گذرنا یہاں سے رو رو کے

جنھیں جانا ہے اس دنیا نے ہم سے
نظر آتے ہیں وہ بیگانے ہم سے

بہارِ میکدہ ہے ہم سے ساقی
سبو ہم سے ہے اور پیمانے ہم سے

بہ فیضِ عشق گذرے ہم جدھر سے
ہوئے آباد سب ویرانے ہم سے

ہمیشہ ہم نے آنسو پی لیے ہیں
نہ چھلکے ہیں کبھی پیمانے ہم سے

من و تو کی صدائیں کہہ رہی ہیں
ہوئے مشہور کچھ افسانے ہم سے

تلاطم اس گھڑی سے آج تک ہے
لیے تھے اشکِ غم دریا نے ہم سے

نگہِ ساقی کی ہے مائل کرم پر
کہا چپکے سے یہ صہبا نے ہم سے

دسمبر ٦ء

کسی کے غم کے اشارے ابھی نہیں بدلے
دلِ حزیں کے ستارے ابھی نہیں بدلے

غمِ حیات کے مارے بدل گئے کتنے
جو ہو گئے ہیں تمہارے ابھی نہیں بدلے

زمیں بدل گئی اور آسمان بھی بدلا
مگر یہ چاند ستارے ابھی نہیں بدلے

وہی ہے یادِ رخِ یار و کاکلِ جاناں
یہ زندگی کے سہارے ابھی نہیں بدلے

پلائے جایئے صہبا کو مست آنکھوں سے
نظر فروز نظارے ابھی نہیں بدلے

سوئی ہوئی قسمت کو جگاؤں کیسے
منزل کی طرف پاؤں بڑھاؤں کیسے
سنتا ہوں کہ دیتا ہے وہ بے مانگے بھی
پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھاؤں کیسے

افسانۂ غم اس کو سناؤں کیسے
حال دل ناشاد بتاؤں کیسے
دامن کے الجھنے میں مزہ ہے کچھ اور
الجھے ہوئے دامن کو چھڑاؤں کیسے

سنہ ۱۹۴۹ء

وہ مری طرزِ شکایات سمجھ لیتے ہیں
آنکھوں آنکھوں میں ہر اک بات سمجھ لیتے ہیں
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے یہ معلوم ہوا
وہ مرے دل کی حکایات سمجھ لیتے ہیں
دام، صیاد، قفس، برق پریشاں تنکے
ہم انھیں چرخ کی سوغات سمجھ لیتے ہیں
رازِ میخانے کے مخمور نگاہوں سے تری
ہم تو اے پیرِ خرابات سمجھ لیتے ہیں
ان کے ہونٹوں پہ کبھی موجِ تبسم پا کر
برق کی دل پہ کرامات سمجھ لیتے ہیں
جب کبھی مژدۂ گل باد صبا لاتی ہے
ہم اسے آمدِ آفات سمجھ لیتے ہیں
بال بکھرے ہوں نظر بدلی اگر ہو صہبا
قہر کی ان کو علامات سمجھ لیتے ہیں

تصوّر کی رسائی ہے جہاں تک
مری فکرِ رسا پہنچی وہاں تک
چمک تھی آنسوؤں کی بجلیاں تھیں
نہ پوچھو کیسے پہنچا آشیاں تک
چمک تاروں نے لی اشکوں سے میرے
زمیں کی بات پہنچی آسماں تک
حقیقت فصلِ گل کی ہم سے پوچھو
کہ پہنچے ہیں بہاروں سے خزاں تک
تھے جتنے مہرباں نامہرباں ہیں
ہوئے ہیں مہرباں نامہرباں تک
زمانے نے اڑائی تھیں جو صہبا
نہیں ہیں ہائے اب وہ دھجیاں تک

جنوری ۱۹۶۱ء

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۱	۵	یاد	یار
۳۶	۳	آہ	آگ
۴۴	۴	آپ	خود ہی
۵۱	۹	شیشہ و دل	شیشۂ دل
۶۲	۱۳	کر	کہہ
۶۶	۱۳	کچھ	یہہ
۸۱	۹	دیر	ابر
۸۸	۸	آشیانہ	آستانہ
۸۹	۲	تو پھر	کبھی
۸۹	۶	نہ ہم مسکرائے نہ ہم مسکرائے	نہ وہ مسکرائے نہ ہم مسکرائے
۹۹	۱۰	چھب جائے	شرمائے
۱۱۵	۸	پر آپ	بر آب
۱۲۸	۱	آشیانہ	آستانہ
۱۴۸	۱۰	مجھے	مری
۱۵۹	۹	میں ہوتا جاتا ہوں دور تر	بہت چاہا رہوں میں دور ہی
۱۶۹	۱۲	نہیں ڈرنے کے	کہاں ڈرتے ہیں
۱۷۳	۶	فرقت نے آنکھوں میں	فرقت میں آنکھوں نے
۱۷۹	۱	مجھ کو	غم کا
۱۸۴	۱۰	آپ	آب

اپنے محترم اساتذہ

ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

پروفیسر عبدالقادر سروری — ڈاکٹر سید سجاد مرحوم

کے نام

جن کے فیضِ تربیت نے میرے ذوقِ سخن کو نکھارا

صہبا

۱

تاروں کی چمک میں اسے دیکھا میں نے
ڈالی کی لچک میں اسے دیکھا میں نے
دیکھا ہے کہاں کہاں اس کو اے دوست
خود دل کی کسک میں اسے دیکھا میں نے

پیمانہ کبھی عمر کا چھلکے گا ضرور
مستی میں سمجھنے کا نہیں ہوتا شعور
تن تن کے جو چلتے ہیں زمیں پر ان کا
ہو جائے گا اک روز زمیں بوس غرور

۱۹۵۲ء

میخانہ لیے پھرتی ہیں پیاری آنکھیں
سرشار بناتی ہیں تمھاری آنکھیں
نظروں سے ذرا اپنی پلا دو اک بار
مدت سے ترستی ہیں ہماری آنکھیں

۵۴ء

شعلے ہیں بھڑکتے ہوئے رخسار نہیں
تلوار ہیں یہ ابروئے خم دار نہیں
ہر گام پہ سو یا ہوا فتنہ اٹھا
آفت ہے قیامت ہے یہ رفتار نہیں

۵۲ء

پھول پھر لے رہے ہیں انگڑائی
پھر گلستاں بہار پر آیا
دھجیاں اڑ گئیں گریباں کی
حرف صبر و قرار پر آیا

آپ تو صرف مسکراتے تھے
اور بجلی گری ادھر دل پر
حال اپنا ہے اس مسافر کا
لُٹ گیا ہو جو آ کے منزل پر

سنہ ۱۹۵۸ء

دوست اپنے دشمنوں کے ہوگئے
دشمن اپنے دوستوں کے ہوگئے
اپنی قسمت میں بُرے دن آگئے
اور اچھے دن بروں کے ہوگئے

کیا کہوں تم سے مسرّت عید کی
عید سے بڑھ کر تمھاری دید کی
تم نے دیکھا مسکرا کر جب مجھے
جگمگا اٹھی کرن اُمّید کی

۵۵ء

غیر جس کو ستم سمجھتے ہیں
ہم تو اس کو کرم سمجھتے ہیں
غیر کیا جانیں آپ کے غم کو
آپ کے غم کو ہم سمجھتے ہیں

سبزہ زار و یہاں سے ہٹ جاؤ
اے بہار و یہاں سے ہٹ جاؤ
بن رہا ہے غمِ حبیب رفیق
چاند تارو یہاں سے ہٹ جاؤ

جولائی ۵۹ء

غم کی پرچھائیوں میں ہے کوئی
میری تنہائیوں میں ہے کوئی
دھڑکنوں سے صدا یہ آتی ہے
دل کی گہرائیوں میں ہے کوئی

ہر قدم پر ستم نظر آئے
اس میں ان کے کرم نظر آئے
چند روزہ حیات میں صہبا
مستقل ہم کو غم نظر آئے

۱۹۵۹ء

اس کے کرم وجود و سخا کو بھولے
اس کے رحم و فضل و عطا کو بھولے
دُنیا کی محبت تو ہمیں یاد رہی
بھولے تو کسے اپنے خدا کو بھولے

کہتے ہو سنبھل جاؤ تو سنبھلوں کیسے
دامن دُرِ مقصود سے بھر لوں کیسے
تدبیر تو ممکن ہے مگر اے صہبا
تحریر مقدر کی میں بدلوں کیسے

سنہ ۱۹۶۰ء

کیا کہوں زندگی کا افسانہ
آنکھ پُرنم ہے لب پہ خاموشی
دیکھتا ہوں پہ کہہ نہیں سکتا
اس قدر ہوش اتنی بے ہوشی

۱۹۶۱

اب مرے دل میں آرزو بھی نہیں
اب کسی شے کی جستجو بھی نہیں
کب تلک روؤں خون کے آنسو
اب تو دل میں مرے لہو بھی نہیں

۱۹۶۱ء

ہمارے گلشنِ دل کی بہار کیا کہنا
تبسمِ لبِ رنگینِ یار کیا کہنا

امید و بیم کے گرداب میں پھنسا ہوں میں
تصوّرِ رخ و گیسوئے یار کیا کہنا

یہ دل وہ شہر ہے جس میں ہے یاد کا مسکن
وہ باغ جس پہ ہوا بر بہار کیا کہنا

امیدِ وصل کا پیہم خیال کیا کہیئے
وہ انتظار کی گھڑیاں ہزار کیا کہنا

کسی نے مست نگاہوں سے مے پلائی ہے
نشیلی آنکھ کا صہبا خمار کیا کہنا

مارچ سنہ ۱۹۳۰ء

شوق کہتا ہے آیئے تو سہی
آکے بے خود بنایئے تو سہی

لاکھ سجدے تڑپ رہے ہیں یہاں
اپنا جلوہ دکھایئے تو سہی

خاک بھی اڑ کے ہالہ بن جائے
میری ہستی مٹایئے تو سہی

دل ہو پامال پر نہ نکلے آہ
ضبط کو آزمایئے تو سہی

آنکھوں آنکھوں میں آج ساقی نے
کہا صہبا سے آیئے تو سہی

سمبر ۱۹۳۰ء

پیش لفظ

(عالی جناب پروفیسر عبدالقادر سروری ام اے ال ال بی۔ صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ)

آج سے کوئی پچیس تیس برس پہلے کی بات ہے کہ جناب ابوالخیر سید ابراہیم حسینی جامعہ عثمانیہ میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ ان کے ہم جماعتوں میں بہت سے صاحبِ ذوق اور صاحبِ عمل نوجوان شامل تھے۔ ان میں امیرِ پائیگاہ نواب ظہیر یار جنگ محسن بن شبیر داؤد حسین، زاہد علی کامل وغیرہ کے چند نام ہیں، جو اب مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ ابوالخیر صاحب ان میں سے کسی سے پیچھے نہیں تھے، بلکہ اپنی جودتِ طبع اور رسا رائی میں شاید وہ سب سے آگے ہی بڑھے ہوئے تھے۔

طالب علمی کا زمانہ بڑی رنگ رلیوں میں بسر ہوگیا۔ خارج از نصاب ساری جدوجہد کے ابوالخیر صاحب روحِ رواں تھے۔ بزمِ اردو کے معتمد چنے گئے اور انجمن اتحاد طلبہ جامعہ عثمانیہ کے صدر منتخب ہوئے۔ اس زمانے میں غالباً وہ شعر سے کبھی کبھی شوق کر لیا کرتے تھے، لیکن اس کی خبر مجھے اور غالباً اساتذہ اردو میں سے کسی کو بھی نہ تھی۔ کم سے کم اس وقت وہ صہبا نہیں تھے، اور ہمارا علم ان کے بارے میں ان کے نام اور کنیت تک محدود تھا۔

کالج سے فارغ ہو کر دوستوں کا یہ مجمع منتشر ہوگیا۔ کسی نے ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں بڑا اہم مقام حاصل کیا، سرکاری ملازمت میں داخل ہو کر ترقی کرتا ہوا کلکٹر کے

کسی کی جنبشِ لب میں تھے جلوے اک زمانے کے
بھلائے سے نہ بھولیں گے وہ منظر مسکرانے کے

یہ تنکے جو پریشاں ہو رہے ہیں آشیانے کے
نشاں ہیں باغ میں صیاد تیرے آنے جانے کے

مجھی سے میری شوریدہ سری کو پوچھنے والے
بتا ذرّات کیا کہتے ہیں تیرے آستانے کے

مری بے تابیوں میں راز ہیں تسکینِ عالم کے
مری بربادیوں میں طور ہیں دُنیا بسانے کے

کبھی محرومیوں نے بڑھ کے خود میرے قدم چومے
کبھی سامانِ عشرت میں نے ٹھکرائے زمانے کے

نگاہِ پاسباں کو مہرباں اپنا سمجھتے ہیں
کچھ عادی اس قدر ہم ہو گئے ہیں قید خانے کے

مسلّم آہ بھی اور آہ کی تاثیر بھی صہبا
مگر قابل کہاں محفل میں ان کی بار پانے کے

پہلو میں دل ہے دل میں مرے اضطراب ہے
اس پر ستم کہ سامنے وہ بے نقاب ہے

اس کی نظر اگر نگہہ کامیاب ہے
میری نظر بھی اس کا مکمّل جواب ہے

تم کو غرورِ حسن مجھے پاسِ وضع کا
"میرا جواب ہے وہ تمھارا جواب ہے"

اے موت ہجرِ یار میں تیرا پتہ نہیں
کمبخت زندگی تو مسلسل عذاب ہے

دیوانہ وار پھول کی خوشبو ہے ان کے ساتھ
اس پر سکوتِ شب ہے، شبِ ماہتاب ہے

پھر شبِ غم آگئی جلنے کا پھر پیغام ہے
پھر لباسِ آتشیں پہنے چراغِ شام ہے
شمع کی ہستی میں پنہاں موت کا پیغام ہے
"ابتدا میں انتہا، آغاز میں انجام ہے"
میرا اظہارِ محبت ان کا اظہارِ جمال
زندگیٔ عشق بس اس کشمکش کا نام ہے
عشق میں مر کر حیاتِ جاوداں حاصل ہوئی
موت کہتے ہیں جسے کیا زندگی کا نام ہے
دل نے کی تھی شوق کی ناکامیوں پر ایک آہ
مجھ پہ افشائے محبت کا عبث الزام ہے
دل میں بیٹھا لے رہا ہے چٹکیاں پیہم کوئی
ہو نہ ہو یہ آپ ہیں یا دردِ خوش انجام ہے
وصل کی شب مختصر کر دی بڑھایا روزِ ہجر
کس قدر بے ربط صہبا گردشِ ایام ہے

ستم چاہتا ہوں جفا چاہتا ہوں
میں اس کے سوا اور کیا چاہتا ہوں

ہوائیں چلیں آہ بر سے فلک پر
دلِ زار و آہِ رسا چاہتا ہوں

ذرا مسکرانا، ذرا دیکھ لینا
کہ کچھ میں بھی تم سے کہا چاہتا ہوں

رخِ یار کا جلوہ ہر شے میں دیکھوں
تصور کی یہ انتہا چاہتا ہوں

میں پروانۂ شمعِ الفت ہوں صہبا
عنایت بہ طرزِ جفا چاہتا ہوں

ان کا جلوہ عمر بھر دیکھا کیا
پھر بھی صورت کے لیے ترسا کیا

سب خطائیں تھیں دلِ مجبور کی
آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا

مختصر یہ ہجر کی روداد ہے
درد اٹھا اور دل بیٹھا کیا

خوگرِ غم ہو گیا اب غم کہاں
درد نے بڑھ کر مجھے اچھا کیا

زندگی بھر مجھ پہ جو ہنستا رہا
وہ لحد پر دیر تک رویا کیا

میری محویت نے حیراں کر دیا
ایک بت کو ایک بت دیکھا کیا

اشک خوں، بے ربط باتیں، رنگ رُخ
سب نے مل کر رازِ دل افشا کیا

چلے آیئے سوتے فتنے جگانے
مرے دل پہ ہنس ہنس کے بجلی گرانے

مرے ضبطِ دل نے مری خامشی نے
رلایا انھیں کس قدر ہے نہ جانے

وہ مہمان بن کر کبھی آ تو جائیں
انھیں روکنے کے کئی ہیں بہانے

مکمّل نمونہ ہے صنعت کا اس کی
بنایا ہے ہاتھوں سے اپنے خدا نے

وہ آئے وہ آئے بصد ناز صہبا
مرے دل کی سوئی اُمنگیں جگانے

دسمبر ۳۵ء

اک تبسّم زیرِ لب ہے گل کو خنداں دیکھ کر
ہے خیالِ خود نمائی ماہِ تاباں دیکھ کر

وہ پئے گلگشت نکلے ہیں بہ طرفِ جوئبار
بڑھ کے فتنوں نے قدم چومے خراماں دیکھ کر

جذبِ دل کا ان پہ اب کچھ کچھ اثر ہونے لگا
خود پریشاں ہو گئے مجھ کو پریشاں دیکھ کر

اب کہاں وہ لطفِ رندی اب کہاں وہ بزمِ عیش
جی تو للچاتا ہے صہبا ابرِ باراں دیکھ کر

لجا لجا کے وہ نظریں ملائے جاتے ہیں
نرالے ڈھنگ سے جادو جگائے جاتے ہیں
کسی کے نام پہ اک آہ اور دو آنسو
غریب دل کی تہی پونجی لٹائے جاتے ہیں
ستم کا جب کوئی پہلو نیا نہیں ملتا
کرم کے پردے میں فتنے اٹھائے جاتے ہیں
جفا کی خیر ہو یارب کہ وہ تغافل کو
میری حیات کا باعث بتائے جاتے ہیں
ذرا سا دل ہے مقابل ہزار جلووں کے
اس ایک قطرے میں دریا سمائے جاتے ہیں
ثباتِ ہستیٔ فانی ہے ایک جھونکے تک
قلعے ہوس کے ہوا میں بنائے جاتے ہیں
غبارِ راہ بنا جن کے واسطے صہبا
وہ میری خاک سے دامن بچائے جاتے ہیں

آپ تیر و کمان رکھتے ہیں
جسم میں ہم بھی جان رکھتے ہیں

کچھ نہ نکلے خدا کرے منہ سے
میری باتوں پہ دھیان رکھتے ہیں

جان مضطر کے پڑ گئے لالے
زندگی پر گمان رکھتے ہیں

تیرے بیمار تیری فرقت میں
اپنی مٹھی میں جان رکھتے ہیں

آج صہبا کو ناز سے دیکھا
دل میں کیا مہربان رکھتے ہیں؟

جولائی ۱۹۳۸ء

بجلیاں خرمن پہ چمکا کر ہنسے
آفتیں وہ دل پہ ڈھا ڈھا کر ہنسے

مجھ کو دیکھا اک نئے انداز سے
زیرِ لب کچھ آپ فرما کر ہنسے

وہ جو آئے جان میں جاں آ گئی
دیکھ کر مسرور شرما کر ہنسے

میکدہ کی شام اور رنگین جام
آج صہبا رنگ میں آ کر ہنسے

جولائی ۳۸ء

عہدہ تک پہنچ گیا، اور کسی نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا تو وہاں ان کا کام اور نام خوب چمکا۔

صہبا صاحب نے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ام اے کی جماعت میں بھی داخلہ لیا تھا، اس وقت مشہور ناول نگار عزیز احمد صاحب ان کے ہم جماعت رہے لیکن جس زمانے میں وہ ام اے میں پڑھ رہے تھے، زندگی کی ضروریات ان کے در پر دستک دے رہی تھیں اور انھیں بلا رہی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ام اے کی تعلیم کی تکمیل کیے بغیر ہم سے جدا ہو گئے۔ ایک مشغلہ انھوں نے بھی اپنے لیے اختیار کر لیا یا مشغلہ نے ان کو اختیار کر لیا۔ نتیجہ بہر حال ایک ہی تھا۔ اب صہبا صاحب کی مصروفیتیں علمی اور تعلیمی نہیں رہی تھیں بلکہ بظاہر ان کی مصروفیتوں کو علم و ادب سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ وہ ایک بڑے شوگر کین فارم کے مہتمم بن کر کچھ تکنیکل قسم کے کام میں گھٹ گئے۔ جس نئی دنیا میں وہ داخل ہوئے تھے وہاں کتابوں اور لفظوں سے ان کا واسطہ نہیں تھا بلکہ اس کی بجائے ان کا سابقہ انسانوں اور بھانت بھانت کے انسانوں اور ان کے مسائل سے تھا۔ کافی طویل عرصے تک میری اور ان کی مدبھیڑ زندگی کے کسی موڑ پر بھی نہ ہو سکی۔ پھر دو تین سال قبل جب ان سے ملنے کا موقعہ ہوا تو دیکھا کہ وہ اچھے خاصے شاعر ہو چکے ہیں اور بڑے بڑے مشاعروں میں اپنا کلام سنا رہے ہیں اور داد تحسین حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی کچھ غزلیں مجھے بھی بہت پسند آئیں اور میں نے ان کی دل کھول کر تعریف کی غالباً یہ اسی کا جرمانہ ہے جو مجھے اس مقدمے کی صورت میں ادا کرنا پڑ رہا ہے لیکن اپنے عزیز اور قدیم طالب علموں کی خاطر میں ایسے ایسے بہت سے جرمانے ادا کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔

صہبا نے فارم کا کام اپنے ذمہ لے کر، بظاہر علم و ادب کی دنیا سے اپنا ناتہ توڑ لیا تھا، لیکن جب میرے سامنے وہ کلام کا ایک مجموعہ لے کر تشریف لائے اور یہ بھی

آج اُن سے جو ملاقات ہوئی
دل کی پُر نور کائنات ہوئی

دیکھ کر اُن کو روتا بالیں پر
موت شرمندۂ حیات ہوئی

شوق کا بس یہ ماحصل نکلا
اُن کو جیت اور مجھ کو مات ہوئی

دل میں رہ رہ کے درد سا اُٹھا
باتوں باتوں میں ایسی بات ہوئی

دیکھ صہبا کی گریہ وزاری
عرق کیوں شرم سے فرات ہوئی

اگست ۳۸ء

جلوے ہزار مجکو دکھاتے چلے گئے
دل کا سرور اور بڑھاتے چلے گئے

مجھ رندِ بادہ خوار کو پینے سے کام تھا
وہ مست انکھڑیوں سے پلاتے چلے گئے

اتنی ہی محویت مری بڑھتی چلی گئی
جتنا وہ ہوش میں مجھے لاتے چلے گئے

وہ خود حسین ان کی ادائیں حسین تر
ہر ذرہ کو حسین بناتے چلے گئے

جب یاد آگیا کوئی بھولا ہوا ستم
فتنے نئے سرے سے جگاتے چلے گئے

صہبا سے پوچھیے کہ وہ بزمِ خیال میں
کس کس ادا سے دل کو لبھاتے چلے گئے

جولائی ۳۰ء

دیکھو نہ مجھ کو آج کرم کی نگاہ سے
پالا ہے میں نے دردِ محبت کو چاہ سے

جن کے لیے میں مٹ کے بنا خاکِ رہگذر
دامن بچا کے چلتے ہیں وہ گردِ راہ سے

تاثیر وہ بھی نالۂ شب گیر کی مرے
ہل چل سی مچ گئی ہے سرِ عرش آہ سے

ہوں تشنہ کام شوق نظر سے نظر ملا
پینے دے کچھ تو پینے دے اپنی نگاہ سے

صہبا کا یہ خیال بھی ہے تجربہ بھی ہے
بڑھتا ہے میل جول تو بس رسم و راہ سے

جنوری ۱۹۴۱ء

ہوں رندِ بادہ خوار پیے جا رہا ہوں میں
ساغر بہ دست ہوں جو جیے جا رہا ہوں میں

دو اشکِ تر ہیں ایک صدائے شکستِ دل
یہ زادِ راہ ساتھ لیے جا رہا ہوں میں

وارفتگیٔ شوق کی کچھ انتہا نہ پوچھ
اتنی خبر ہے سجدے کیے جا رہا ہوں میں

محتاج بن کے غیر پہ تکیہ میں کیوں کروں
پیوند اپنے آپ سیے جا رہا ہوں میں

صہبا نہ پوچھ مجھ سے مرا مقصدِ حیات
لے کر کسی کا نام جیے جا رہا ہوں میں

جنوری ۱۹۴۶ء

مداوا دردِ دل کا جب نہ ہو ضبطِ فغاں کیوں ہو
زباں بندی کا جب دستور ہو منہ میں زباں کیوں ہو

تمہارا نام لینا اور تم کو دیکھتے رہنا
یہی مقصد ہے جب اپنا تمنائے جناں کیوں ہو

تعلق کچھ نہ کچھ خاشاک کو برقِ تپاں سے ہے
چمکتی ہو جہاں بجلی وہیں پر آشیاں کیوں ہو

مری بربادیوں کے دھوم سے ہونے لگے ساماں
حیاتِ نو کا یہ مژدہ ہے کوئی سرگراں کیوں ہو

وہ آئیں مرگِ خوش کامی نہ آئیں مرگِ ناکامی
جہاں ممکن ہے شادی مرگ، مرگِ ناگہاں کیوں ہو

ہے اپنی زندگی کی عمر صہبا ایک دو آہیں
جہاں دھوکے نظر کے ہوں وہاں تسکینِ جاں کیوں ہو

نومبر ۴۱ء

ہم اشتیاقِ قلب و جگر دیکھتے رہے
جب بھی کسی کا تیرِ نظر دیکھتے رہے

جام و سبو سے واسطہ کب شیخ جی کو ہے
ساغر کو بار بار مگر دیکھتے رہے

فرصت کہاں کہ دیکھتے اپنی برائیاں
ہم دوسروں کے عیب مگر دیکھتے رہے

صہبا یہی ہے اپنے تصوّر کی انتہا
ان کو ہمیشہ پیشِ نظر دیکھتے رہے

نومبر ۱۹۸۱ء

واقف ہوں سوزِ عشق سے سازِ فغاں سے میں
منزل کی راہ پاتا ہوں اشکِ رواں سے میں

دو تنکے آشیاں کے تھے نذرِ خزاں ہوئے
کیا خاک لے کے جاؤں گا اب گلستاں سے میں

ہر آس یاس بن گئی محفل میں یار کی
حرفِ غلط کی طرح اٹھا درمیاں سے میں

جو بات منہ سے نکلی وہ اپنی نہیں رہی
کس طرح دل کی بات کہوں رازداں سے میں

صہبا ستارے اپنے تو گردش ہی میں رہے
انصاف چاہوں وہ بھی بھلا آسماں سے میں

نومبر ۴۱ء

موسمِ گل ہو، تر شح ہو، گھٹا چھائی ہو
اک نئے طور سے پھر انجمن آرائی ہو

میری تقدیر کی خوبی سے وہ آجائیں ادھر
اُن کا جلوہ ہو، مری آنکھ تماشائی ہو

وہ تو آئیں گے سنیں گے بھی مری عرضِ وفا
ہے دعا مجھ کو عطا طاقتِ گویائی ہو

دل نے نالہ کیا، رسوا ہوا، نیچا دیکھا
ایسا برباد نہ تیرا کوئی شیدائی ہو

آج صہبا کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے
کیا تعجب ہے جو پہلے سے شناسائی ہو

نومبر ۴۲ء

قفس نصیب ہوں پابندِ مرضئ صیاد
نہ تابِ نالہ ہے مجھ میں نہ طاقتِ فریاد
مٹائے سے نہ مٹے گی تمھاری دل سے یاد
اگر یہ روح بھی ہو جائے جسم سے آزاد
جنوں کو جوش ہے بڑھتے ہیں حوصلے دل کے
پھر آیا موسمِ گل وقتِ نالہ و فریاد
کسی کا ایک تبسّم ہے وجہِ رونقِ دل
کسی کی ایک نگہ مقصدِ دلِ ناشاد
شکستِ شیشۂ دل کی صدا جو سن لیتے
کبھی نہ پوچھتے مجھ سے وہ دل کی روئیداد
بلا سے راہِ تمنّا میں ہیں اگر کانٹے
ہے شوقِ راہ نما میرا ہر چہ باد آباد
دو اشک تر ہی ندامت کے رہ گئے صہبا
کریں گے کنجِ لحد میں یہی مری امداد

ہم اپنے ہجر کی روداد بھی سنا کے رہے
زبانِ حال سے سب کچھ انھیں بتا کے رہے

خیال بن کے جو لیتے تھے چٹکیاں دل میں
سرور بن کے وہ آنکھوں میں بھی سما کے رہے

نہ رہ سکے کبھی پنہاں نگاہِ عاشق سے
تھے لاکھ پردے مگر سامنے وہ آ کے رہے

ثباتِ عمرِ دو روزہ کا حال مت پوچھو
سفینہ غم کا تھا، جھونکوں میں ہم فنا کے رہے

رہے ہمیشہ جھمیلوں سے دور دنیا کے
ہم اپنی چھوٹی سی دنیا الگ بنا کے رہے

نہ ڈگمگائے ہمارے قدم کبھی صہبا
ہاں گرچہ سخت بہت مرحلے وفا کے رہے

اپریل ۴۵ء

فرمایا کہ یہ صرف انتخاب ہے اور ان کے کلام کا ابھی کافی ذخیرہ موجود ہے، تو مجھے یقین ہو گیا کہ عشق و محبت اور شعر و سخن دونوں جب گلے پڑتے ہیں تو عمر بھر پیچھا نہیں چھوڑتے۔ جو روگ صہبا نے غالباً طالب علمی کے زمانے میں لگا لیا تھا اس سے وہ کبھی پیچھا نہ چھڑوا سکے یہ ان کی زندگی کا سہارا بلکہ زندگی بن گیا۔

اصل میں ابوالخیر صاحب کا علم و ادب سے لگاؤ، توریثی ہے۔ وہ حیدرآباد کے ایک برگزیدہ مشائخ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے خاندان کے اکثر بزرگوں کو ارشاد و ہدایت سے تعلق رہا ہے۔ اس لیے شعر و سخن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے انھیں زیادہ جد و جہد نہیں کرنی پڑی۔

شعر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جذبات کا از خود چھلکاؤ ہے۔ جہاں تک ابوالخیر صہبا کی شاعری کا تعلق ہے یہ بات بہت ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ ان کے ایک مخلص دوست اور میرے عزیز شاگرد مغنی تبسم صاحب نے مجھے بتایا کہ صہبا صاحب اپنی مفوضہ خدمات انجام دیتے ہوئے بھی جوں ہی ذرا فرصت مل جاتی ہے شعر موزوں کر لیتے ہیں اور اکثر صورتوں میں اچھا شعر کہہ لیتے ہیں۔ ان کی اس عادت کو دیکھتے ہوئے حسرت مرحوم کا یہ شعر یاد آجاتا ہے :-

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقّت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

صہبا کو خدانخواستہ چکّی کی مشقّت سے سابقہ تو کیوں پڑنے لگا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے درمیان کام کرتے ہوئے وہ کچھ دیرپا تجربے بھی حاصل کرتے جاتے ہیں، اور یہ تجربے موقع ملتے ہی شعر کے روپ میں ڈھلنے لگتے ہیں۔

حسرت اول شاعر تھے اور پھر سیاست داں اور سب کچھ۔ ہم کو ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ کئی صاحبِ ذوق زندگی کے کاروبار میں ہمہ تن مصروف رہے، اور

یاد ہے مجھ کو کسی کے مسکرانے کا سماں
ہنستے ہنستے دل کی ہستی کو مٹانے کا سماں

یاد ہے کہتے ہوئے کھیتی ہری ہو جائے گی
خرمنِ دل پر مرے بجلی گرانے کا سماں

گرنے والے کو سہارا دے گیا اُن کا خیال
ہے ابھی تک یاد گرتے کو بچانے کا سماں

یاد ہے وہ سیرِ گل کلیوں سے ان کی چھیڑ چھاڑ
گنگناتے کھیلتے چٹکی بجانے کا سماں

دستِ رنگیں میں مئے رنگیں کا وہ منظر حسیں
یاد ہے صہبا ہمیں پینے پلانے کا سماں

اپریل ۴۵ء

کوئی سکھا رہا ہے آداب بندگی کے
پھر مل رہے ہیں مجھ میں آثار زندگی کے

آنے لگے ہیں آنسو آنکھوں میں اب خوشی کے
جلوے سما رہے ہیں نظروں میں پھر کسی کے

کچھ لطف آ رہا ہے اب زندگی کا صہبا
حلقہ بگوش جب سے ہم ہو گئے کسی کے

دل میں سما گئے ہیں آنکھوں میں چھپ گئے ہیں
اسباب ہیں فراہم سب اپنی بے خودی کے

احباب آ رہے ہیں پرسانِ حال سارے
سامان ہو رہے ہیں صہبا کی واپسی کے

جولائی ۴۵ء

فکرِ حیات ہے نہ غمِ روزگار ہے
پھر کس لیے اب آنکھ مری اشک بار ہے

شاید کسی کے آنے کا یہ انتظار ہے
دل بھی وفورِ شوق سے بے اختیار ہے

یہ جانتا ہے اُن سے وفا کی نہیں امید
اس پر بھی آج دل کو بہت اعتبار ہے

پھر کس لیے ہے بغض و حسد دل میں موجزن
دنیا کو جانتے ہیں کہ ناپائیدار ہے

ساقی کی چشمِ مست سے پیتا ہے جو شراب
صہبا کو لوگ کہتے ہیں یہ بادہ خوار ہے

ستمبر ۴۵ء

غمِ دل بھلانے کو جی چاہتا ہے
نہ آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے

نہ پوچھو ستم ہائے دنیا نہ پوچھو
بس اب مسکرانے کو جی چاہتا ہے

وہ روٹھیں ذرا سی خطا پر وہ روٹھیں
انھیں اب منانے کو جی چاہتا ہے

ستم اور ان کا ستم کچھ نہ پوچھو
ستم پھر اٹھانے کو جی چاہتا ہے

چلا ہوں بصد شوق در پر کسی کے
کہ دھونی رمانے کو جی چاہتا ہے

ہے ان کا تبسم دل و جاں کا طالب
یہ پونجی لٹانے کو جی چاہتا ہے

وہ پھر آ رہے ہیں تصور میں صہبا
کہ شاید ستانے کو جی چاہتا ہے

نومبر ۴۵ء

کیا جانیے کیا ہو کے رہے عشق کا انجام
اب سانس کی ہر آمد و شد میں ہے ترا نام

مجبورِ فنا کے لیے ہستی کی بشارت
یہ بھی ہے ترا شعبدہ اے گردشِ ایام

ناکامیٔ قسمت کا گلہ کس سے کریں ہم
تھے موت کے خواہاں تو ملا زیست کا الزام

انکار میں اقرار کی اک شکل ہے پیدا
دیتی ہے خبر صبح کی جس طرح ہر اک شام

اک آپ کی دُنیا ہے بدلتی ہے ہر اک آن
اک اپنا جہاں ہے کہ وہی صبح وہی شام

نومبر ۴۵ء

اُن کی پیشانی میں انوارِ سحر پاتا ہوں میں
آفتابِ زندگی کو اوج پر پاتا ہوں میں

دونوں عالم کا اسی کو مقتدر پاتا ہوں میں
پھر بھی انساں پر مدارِ خیر و شر پاتا ہوں میں

کچھ نہ کچھ اس میں محبت کا اثر پاتا ہوں میں
آج ہر سوکھے شجر میں برگ و بر پاتا ہوں میں

خاک و باد و آب و آتش کی بظاہر زندگی
آپ ہی کی ایک کن پر منحصر پاتا ہوں میں

وہ تو بیٹھے کھیلتے ہیں سانس کے ہر تار سے
وائے قسمت ان کو پھر بھی دور تر پاتا ہوں میں

کیف سے خالی ہو لطفِ زندگی حاصل نہ ہو
فائدہ کیا اس سے عمرِ خضر گر پاتا ہوں میں

پھر کسی کے نام پر لٹتی ہے دل کی کائنات
موتیوں سے پُر ہر اک تارِ نظر پاتا ہوں میں

آپ کے آنے کا مجکو کچھ گماں ہے کچھ یقیں
زندگی بیم و رجا میں مستتر پاتا ہوں میں

جب سے اک تصویر سی آنکھوں میں میری کھنچ گئی
حال این و آں سے خود کو بے خبر پاتا ہوں میں

ہے اساسِ زندگی صہبا فقط تابِ نظر
یہ نہ ہو تو دل کو پھر زیر و زبر پاتا ہوں میں

نومبر ۴۵ء

طور ہی کچھ بدل گئے دل کے
کیا کیا اس نگاہ نے مل کے

ان سے ملتے ہی یاد کچھ نہ رہا
سب گلے شکوے رہ گئے دل کے

جن کا شیوہ تھا بے رخی اب تک
اب وہ رہنے لگے ہیں ہل مل کے

جن کو رکھتے تھے ہم لگا کے گلے
آج جاتے ہیں وہ گلے مل کے

حُسن پھر ہو رہا ہے جلوہ نما
حوصلے بڑھ رہے ہیں پھر دل کے

دیکھ لیتے تو ہیں وہ حسرت سے
ہم ہیں ممنون اہلِ ساحل کے

شوق منزل کا ہے اثر صہبا
کچھ نشاں مل رہے ہیں منزل کے

دسمبر ۴۵ء

نگاہ ڈالی جو دنیا پہ سرسری میں نے
ہر ایک چیز میں دیکھی ہے بے رخی میں نے
ندائے ہاتف غیبی تھی جو سُنی میں نے
لُٹا دیے ہیں دل و جاں ہنسی خوشی میں نے
ابھی تک آنکھوں میں رقصاں ہے ایک شکلِ جمیل
کسی کے ہونٹوں پہ دیکھی تھی کل ہنسی میں نے
ہوا ہے حسرت و ارماں کا خوں زہے قسمت
متاعِ دل بھی لٹا دی رہی سہی میں نے
سنبھل سکا نہ کسی کی نگاہ سے گر کر
قصور اتنا ہے میرا کہ آہ کی میں نے
جو بیچ دیتے ہیں کردار مال و زر کے لیے
جہاں میں دیکھے ہیں ایسے بھی آدمی میں نے
خلوص ہی پہ حصر زندگی کا ہے صہبا
اسی کے سایہ میں اکثر پناہ لی میں نے

دسمبر ۴۵ء

اتنا اثر بھی قلب میں پیدا نہ کر سکے
وہ ہو رہیں ہمارے ہم ایسا نہ کر سکے

کیوں میرے دردِ دل کا مداوا نہ ہو سکا
بیمارِ غم کو آپ بھی اچھا نہ کر سکے

ہے حسن کو خیالِ نمائش بھی فطرتاً
رہ کر حجاب میں بھی وہ پردا نہ کر سکے

اللہ رے شکستہ دلی میں وفورِ یاس
ان کے حضور عرضِ تمنّا نہ کر سکے

اک مستقل عذاب ہے صہبا یہ زندگی
پر ہم غمِ حیات کو رسوا نہ کر سکے

فروری ۱۹۴۶ء

اوقاتِ فرصت میں شعر سے شوق کیا۔ اس کے باوجود اچھا کلام سرانجام کر گئے۔ اس نوع کے سخن طرازوں کے کلام میں بعض وقت کچھ اجنبیت کے ساتھ ندرت بھی نمایاں ہو جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے شعر کہنے کا محرک ضرورت نہیں بلکہ میلان طبع ہوتا ہے۔ صہبا کا شمار بھی اسی زمرے کے سخن سنجوں میں ہو سکتا ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے، صہبا نے فنِ شعر کا اکتساب روایتی طریقے سے نہیں کیا، اور کسی استادِ فن کے آگے ان کے زانوئے شاگردی تہہ نہیں ہوئے۔ تلمذ کا روایتی طریقہ، زبان، اسلوب اور شعر کی ٹیکنیک میں اصلاح کا سبب تو ہوتا ہے لیکن شعر کی رُوح سے اسے بسا اوقات سروکار نہیں ہوتا۔ طریقہ تلمذ کا یہ فائدہ ضرور ہو جاتا ہے کہ اظہار کے اسالیب سڈول ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ذہن شاعری میں سانچوں کے سڈول پن سے ایسے مانوس ہو گئے ہیں کہ اب ان میں ذرا سے تجاوز پر بھی کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ صہبا کی شعر گوئی کا محرک دراصل ان کا فطری رجحان، اور زبان پر عبور ان کا سہارا اور فطری ذوق ان کا رہنما ہے۔ انھیں وسیلوں کے سہارے انھوں نے کافی کلام سرانجام کر لیا ہے جس کا صرف ایک جُزیہ مجموعہ ہے۔

غنائی شاعری سے صہبا کو زیادہ لگاؤ ہے۔ ابتدا میں جب یہ شعر کہنے کی طرف مائل ہوئے تو غزل کا ہموار راستہ ان کے سامنے تھا۔ غزل کی مقبولیت اور رومانی موضوعات کی کشش نے انھیں اپنی طرف کھینچا۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں نظم بہت مقبول ہو رہی ہے اور نوعمر شعرا اور خود ان کے ساتھی شعرا میں ایک طبقہ، نظم کو نئے نئے اسالیب سے برتنے پر مائل ہے اور اس صنف میں ہیئت اور موضوع ہر پہلو سے نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے ان شعراء کی مقبولیت میں اضافہ بھی ہو رہا ہے، اس کے باوجود صہبا تغزل کے اپنے

روکر نہ دردِ ہجر کا چرچا کریں گے ہم
اب یوں نہ اپنے عشق کو رسوا کریں گے ہم

مقصد یہی مراد یہی آرزو یہی
ان کو بٹھا کے سامنے دیکھا کریں گے ہم

ذرّہ میں آفتاب ہے قطرہ میں بحر ہے
اپنے ہی دل میں آپ کو ڈھونڈا کریں گے ہم

جب موت سے سکون ملے، مدعا ملے
پھر زندگی کو لے کے بھلا کیا کریں گے ہم

صہبا اگر ہے ساقی کی چشمِ کرم ادھر
جام و سبو سے خوب ہی کھیلا کریں گے ہم

فروری ۱۹۶۶ء

یہ دل کچھ نہ تھا دل لگانے سے پہلے
محبت کی دنیا بسانے سے پہلے
نظر پھیر لی مسکرانے سے پہلے
لیا امتحاں آزمانے سے پہلے
معرّا کتابِ محبت تھی یکسر
تمہارے ہمارے فسانے سے پہلے
پریشاں تھے تنکے ہراساں تھی بجلی
چمن میں مرے آشیانے سے پہلے
غضب ہے کسی کا ادھر دیکھ لینا
گرانے کی کوشش پلانے سے پہلے
نہ گل میں مہک تھی نہ مستی ہوا میں
چمن میں ترے آنے جانے سے پہلے
ذرا دیکھنا ان کی نظروں کا عالم
غزل اپنی صہبا سنانے سے پہلے

اکتوبر ۴۶ء

تصوّر میں خزاں ہے اور میں ہوں
خیالِ آشیاں ہے اور میں ہوں
نصیبِ دشمناں ہے اور میں ہوں
یہاں بہ نگراں ہے اور میں ہوں
نظر کے ساتھ ہے گردش میں ساغر
شرابِ ارغواں ہے اور میں ہوں
کبھی کا جل چکا میرا نشیمن
مٹا سا اک نشاں ہے اور میں ہوں
ستارے جھلملاتے ہیں مژہ پر
وفا کی داستاں ہے اور میں ہوں
مجھے دُنیا نے سمجھا ہے تماشا
تماشا ہے جہاں ہے اور میں ہوں
جسے سمجھا تھا صہبا رازداں میں
وہی اب بدگماں ہے اور میں ہوں

اکتوبر ۱۹۴۶ء

کچھ تو چنگ و رباب میں گذری
کچھ شراب و کباب میں گذری

فکرِ دنیا سے کب نجات ملی
عمر ساری عذاب میں گذری

ساتھ دیتے رہے زمانہ کا
اک نہ اک انقلاب میں گذری

کٹ گئی عمر تو ہوا معلوم
جو بھی گذری ہے خواب میں گذری

تجکو واعظ کہاں خیالِ عمل
صرف ذکرِ ثواب میں گذری

دل کے ارمان رہ گئے دل میں
عمر چشمِ پُرآب میں گذری

حیف ہم کر سکے نہ کچھ صہبا
فکرِ روزِ حساب میں گذری

بھلا دے غم کو اب دل سے بھلا دے
غمِ ایّام پر تو مسکرا دے
گرا دے اشک پلکوں سے گرا دے
یہ سرمایہ وفا کا ہے لٹا دے
بھڑکنا چاہتے ہیں دل کے شعلے
ستم گر اپنے فتنوں کی ہوا دے
بھلا ہوگا ترا اے برقِ مضطر
نشیمن کو اگر میرے جلا دے
سہاروں میں ہے بس اس کا سہارا
جسے کوئی نہ دے اس کو خدا دے
نہ ڈر طوفاں سے تو اپنا سفینہ
خدا پر چھوڑ دے لنگر اٹھا دے
جسے حسرت نہ ہو جینے کی صہبا
اسے کوئی نہ تکلیفِ دوا دے

جنوری ۴۷ء

ہیں میکدہ بردوش یہ گھنگھور گھٹائیں
دیوانہ بناتی ہیں یہ مدہوش ہوائیں

فطرت نے کیا حسن کو پابند نظر بھی
اے ذوقِ نظر اس میں نہیں تیری خطائیں

پیغام حیاتِ ابدی دیتی چلی ہیں
دامن کو ترے چھو کے جو آتی ہیں ہوائیں

کچھ اس کی عطاؤں سے بنا کام ہمارا
بخشش کا سبب بن گئیں کچھ اپنی خطائیں

جس حال میں ہے ٹھیک ہے مسرور ہے صہبا
احباب کرم کر کے نہ احسان جتائیں

جون ۴۷ء

پریشاں زلف لے کر بام پر آنے کے دن آئے
کسی کے مسکرانے کے ستم ڈھانے کے دن آئے

نگاہوں میں ہے شوخی چال میں مستانہ پن آیا
حریم حُسن کے پردوں کے اٹھ جانے کے دن آئے

چمن کے ذرّہ ذرّہ میں ہوا ذوقِ نمو پیدا
اٹھو کلیو تمھارے اب چٹک جانے کے دن آئے

نشیمن کے لیے تنکے اکٹھا کرتا جاتا ہوں
کہ اب برقِ تپاں کے غیظ میں آنے کے دن آئے

فضاؤں کی یہ مستی کہہ رہی ہے بادہ خواروں سے
مبارک ہو کہ اب ساغر کو چھلکانے کے دن آئے

چلو صہبا وہ دیکھو ابر بھی کہسار سے اٹھا
سبو کے خم کے مے کے جام و پیمانے کے دن آئے

جولائی ۱۹۴۷ء

اس کی تجلیات کا ہر دم ظہور تھا
کہتے ہیں جس کو دل وہ حقیقت میں طور تھا

مانا کہ اس میں دل کا بھی اپنے قصور تھا
دل کی لگی میں دخل کسی کا ضرور تھا

یوں بڑھ رہا تھا پائے طلب راہِ شوق میں
آنکھوں میں نور دل میں وفا کا سرور تھا

ہر ہر قدم پہ عشق بھی تھا صبر آزما
میرے بھی ساتھ ایک دلِ ناصبور تھا

ساقی کے پائے ناز سے اٹھتا نہیں تھا سر
صہبا کو لوگ کہتے ہیں نشہ میں چور تھا

جولائی ۱۹۷۰ء

پوچھو نہ مجھ سے لطف شبِ انتظار کا
آنکھوں میں پھر رہا تھا اک عالم بہار کا

دیوانگیٔ شوق نہ لے جائے پھر کہیں
بڑھتا ہے حوصلہ دلِ بے اختیار کا

پونجی لٹا رہا ہوں دلِ دردمند کی
مجھ پر کرم ہے دیدۂ خونبار کا

پیتے ہیں مے وہ بزم میں کیوں جانتا ہوں میں
لیتے ہیں امتحاں مرے صبر و قرار کا

قسمت کی گردشوں سے یہ صہبا پتہ چلا
کوئی وطن نہیں ہے غریب الدیار کا

اگست ۴۷ء

دل کی ہر دھڑکن تری آواز ہے
بس یہی ہم راز ہے دم ساز ہے

خود بخود آنے لگا ان کا خیال
اس میں بھی پوشیدہ کوئی راز ہے

آہ لب پر رک گئی آنسو تھمے
عشق کا یہ بھی تو اک اعجاز ہے

آندھیوں میں گھر چکا ہے آشیاں
اور ہر تنکا پرِ پرواز ہے

باندھ کر رختِ سفر صہبا بھی اب
چشم بر رہ، گوش بر آواز ہے

دسمبر ۷۲ء

پرانے اصول پر قائم ہیں، تو پھر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس طرز شاعری سے ان کا لگاؤ رسمی نہیں بلکہ ذاتی ہے۔

قدیم انداز کے پیرو ہوتے ہوئے بھی اپنے عصر میں شعری اسالیب کا جو ارتقاء عمل میں آتا رہا، اس سے صہبا بالکلیہ کورے نہیں رہ سکتے تھے چنانچہ ہم کو ان کے یہاں تجاوز کے کچھ نقوش بھی ملتے ہیں۔ مجموعے میں رباعی، قطعہ، غزل، ساری اصناف کا کلام شامل ہے، لیکن اس کی ترتیب میں تسمیہ اور توضیح سے گریز اس عصر کی ندرت پسندی کا ایک عکس ہے۔ صہبا کی نظر حسن کی متلاشی ہے اور حسن کو اس کے شیونات اور مظاہر میں تاڑ بھی سکتی ہے چنانچہ انھوں نے حسن کے تیور کو کہیں کہیں عمدگی سے ظاہر کرنے کی کوشش بھی کی ہے، مثال کے لیے ذیل کے شعر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

تو سازِ زندگی ہے تو مضرابِ زندگی ہے بے صدا یہ تارِ رگِ جاں ترے بغیر

وہ جو آئے جان میں جاں آگئی دیکھ کر مسرور شرما کر ہنسے

تاروں کی چمک میں اسے دیکھا میں نے ڈالی کی لچک میں اسے دیکھا میں نے

دیکھا ہے کہاں کہاں اس کو اے دوست خود دل کی کسک میں اسے دیکھا میں نے

تغزل صہبا کی نمایاں خصوصیت ہے۔ جیسا کہ ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے، ان کے اکثر اشعار ٹھیٹ تغزل کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ مثلاً ذیل کے اشعار:-

تم کو غرورِ حسن مجھے پاسِ وضع کا میرا جواب ہے نہ تمہارا جواب ہے

لجا لجا کے وہ نظریں ملائے جاتے ہیں نرالے ڈھنگ سے جادو جگائے جاتے ہیں

مجھ کو دیکھا اک نئے انداز سے زیرِ لب کچھ خود ہی فرما کر ہنسے

تغزل کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں کہیں کہیں کائناتی قدروں کا احساس بھی ملتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

خیال و خواب کی دُنیا پہ چھا کے پیتا ہوں
غمِ حیات کو دل سے بُھلا کے پیتا ہوں
حیات و موت کی ہر کشمکش سے ہو کر دور
تعینات کے پردے اٹھا کے پیتا ہوں
خدا کے واسطے اے محتسب نہ روک مجھے
اشارہ چشمِ کرم کا میں پا کے پیتا ہوں
وہ دیکھ لیتے ہیں جب رس بھری نگاہوں سے
شراب و شعر کی دنیا جگا کے پیتا ہوں
وہ رندِ مست ہوں جس انجمن میں جاتا ہوں
اسی کو میکدہ اپنا بنا کے پیتا ہوں
سبو سے کام نہ ساغر سے واسطہ صہبا
کسی کی نظروں سے نظریں ملا کے پیتا ہوں

فروری ۴۳ء

محبت میں محبت ہی دلیلِ زندگانی ہے
جو اس منزل کو پا لیتا ہے اسی کی کامرانی ہے

جہاں برقِ تجلّی ہے وہیں ذوقِ نظر بھی ہے
جسے سب موت کہتے ہیں حیاتِ جاودانی ہے

زمانہ کے بہت سے رنگ دیکھے اور دیکھیں گے
یہ ہے دارِ فنا ہر شے یہاں کی آنی جانی ہے

یہ ہنستی صورتیں یہ دل لبھانے والی سب شکلیں
یہ سب دھوکے نظر کے ہیں حقیقت سب کی فانی ہے

جولائی ۴۰ء

اشک ہیں کیوں رواں نہیں معلوم
رک گئی کیوں زباں نہیں معلوم

اس کا جلوہ ہے ذرّہ ذرّہ میں
اس کا نام و نشاں نہیں معلوم

لے چلا ہے مجھے خیالِ یار
جا رہا ہوں کہاں نہیں معلوم

جھگڑے مٹنے لگے من و تو کے
کون ہے درمیاں نہیں معلوم

سر جھکانے چلا ہوں میں صہبا
ہے کہاں آستاں نہیں معلوم

فروری ۱۹۴۹ء

دل کا صبر و قرار تم سے ہے
زندگی کی بہار تم سے ہے

تم سے دُنیا بھی دین بھی تم سے
حرکت قلبِ زار تم سے ہے

جی رہا ہوں تمہارا لے کر نام
زیست کا اعتبار تم سے ہے

بوئے گل تم سے رنگِ گل تم سے
لطفِ فصلِ بہار تم سے ہے

لاج رکھنا غریب صہبا کی
نسبتِ خاکسار تم سے ہے

مئی ۴۹ء

خدا جانے کب اپنی منزل پہ پہنچیں
ابھی مرحلے درمیاں اور بھی ہیں

ڈراتی ہے کیوں ہر گھڑی برق مجھ کو
چمن میں کئی آشیاں اور بھی ہیں

بھلا ہو گا تیرا ٹھہر جا خزاں کچھ
چمن میں ہری پتّیاں اور بھی ہیں

نظارہ گئی بن کے حیرت مجسّم
ابھی حسن کی شوخیاں اور بھی ہیں

کہاں جائیں صہبا وطن چھوڑ کر ہم
یہ مانا کہ دلکش جہاں اور بھی ہیں

ستمبر ۴۹ء

کر کے دل کو مرے مجبور پلا دے ساقی
عشق کا ہے یہی دستور پلا دے ساقی

پھر پلا دے مئے انگور پلا دے ساقی
نشہ ہو جائے نہ کافور پلا دے ساقی

تیری مخمور نگاہوں کی قسم دیر نہ کر
تجھ سے ہو تیری بلا دور پلا دے ساقی

آرزو ہے کہ محبت میں تری کھو جاؤں
تیرے قرباں ئے منصور پلا دے ساقی

جھومتا جائے گا صہبا ترے میخانے سے
پھر وہی ساغر پُر نور پلا دے ساقی

جنوری سنہ ۵ء

میں آیا ہوں سہارا تیری بخشش کا یہاں لے کر
نہ کر شرمندہ مجھکو اور میرا امتحاں لے کر

جدھر دیکھو چمن ویران ہے اہلِ چمن غمگیں
میں تنہا کیا کروں ایسے میں اپنا آشیاں لے کر

کوئی ڈالی بھی اے برقِ تپاں زد سے نہیں باہر
بناؤں کس جگہ جاؤں کہاں میں آشیاں لے کر

حیاتِ چند روزہ نام ہے جب اشکِ پیہم کا
بھلا میں کیا کروں گا خضرِ عمرِ جاوداں لے کر

غم واندوہ و درد و یاس و حرماں، رنج و غم صہبا
چلا ہوں شہرِ خوباں میں یہ اپنا کارواں لے کر

فروری ۵۰ء

نویدِ فصلِ گل سے چاک دامانوں پہ کیا گذری
خدا ہی جانتا ہے تیرے دیوانوں پہ کیا گذری

رہی شمعِ فروزاں رات بھر مستی کے عالم میں
بھلا وہ کس طرح جانے گی پروانوں پہ کیا گذری

صدائے قلقلِ مینا نہ شورِ جام و پیمانہ
کوئی پوچھے تو رندوں سے کہ میخانوں پہ کیا گذری

کوئی چشمِ حقیقت ہیں اگر آ کر یہاں دیکھے
یہ ویرانے بتا دیں گے کہ ایوانوں پہ کیا گذری

بہت ہی دل شکستہ تھا بہت غمگین تھا صہبا
نہیں معلوم بے چارے کے ارمانوں پہ کیا گذری

فروری سنہ ۵۰ء

دل میں طوفان پھر نہ آئیں گے
ایسے ہیجان پھر نہ آئیں گے

تیرے در سے چلے ہیں اب اٹھ کر
خانہ ویران پھر نہ آئیں گے

خون ایسا ہوا ہے ارماں کا
دل میں ارمان پھر نہ آئیں گے

کھیل موجوں سے اور تلاطم سے
ایسے طوفان پھر نہ آئیں گے

مے ہے، ساقی ہے دیر ہے صہبا
ایسے سامان پھر نہ آئیں گے

جون ۱۹۵۰ء

نظر کا دھوکا تھا جو آسماں نظر آیا
کھلی جو آنکھ تو مجھ کو دھواں نظر آیا

جہاں تمھارے قدم کا نشاں نظر آیا
اسی میں رنگِ گلستاں عیاں نظر آیا

کرم کی ہم پہ نظر ہو کہاں ہمارے نصیب
ستم ہی جب انھیں بارِ گراں نظر آیا

خدا ہی آئے گا اے ناخدا مدد کو مری
تری مدد میں مجھے تو زیاں نظر آیا

نہ کوئی رہبرِ صادق نہ کوئی راہ نما
ہمیں بھٹکتا ہوا کارواں نظر آیا

خوشی میں آنکھوں سے آنسو جو گر گئے صبا
ہمیں بہار میں دورِ خزاں نظر آیا

فرصت کہاں کہ دیکھتے اپنی برائیاں ہم دوسروں کے عیب مگر دیکھتے رہے
خدا سا دل ہے مقابل ہزار جلووں کے اس ایک قطرہ میں دریا سمائے جاتے ہیں

اسی سلسلے میں صہبا کی شاعری کے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے جس میں عرفانِ حیات کی بھی کچھ جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً:

جہاں برقِ تجلّی ہے وہیں ذوقِ نظر بھی ہے جسے سب موت کہتے ہیں حیاتِ جاودانی ہے

شعر و ادب میں خیال کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن بعض وقت بیان کے انداز کی وجہ سے بھی ادب میں روشنی کی کرن جگمگانے لگتی ہے۔ اس سلسلے میں تشبیہہ، استعارہ اور کنایہ کا استعمال اور بر جستہ استعمال خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ ایسی مثالیں اس مجموعے میں خاصی تعداد میں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ذیل کی رباعی ملاحظہ ہو:۔

ہر وقت ہی آنکھوں میں نمی رہتی ہے
اک غم کی گھٹا دل پہ جمی رہتی ہے
نالہ مرا رک جاتا ہے لب پر جیسے
ساحل کے قریں موج تھمی رہتی ہے

غزل گو شاعروں کے لیے ایک عام دقت یہ ہے کہ مضامین شعرا کثر انھیں پامال ملتے ہیں۔ تاہم جنھیں بیان پر قدرت ہوتی ہے وہ اسالیب کے سانچوں میں ایسی ندرت پیدا کر دیتے ہیں جس سے مضمونِ شعر خود شاعر کا اپنا تجربہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ صہبا کے یہاں بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً

کون کہتا ہے نشیمن پہ گری ہے بجلی میری قسمت کا چمکتا ہوا تارا ہوگا
یہ مانا ہوں نظر سے دور لیکن کبھی وہ یاد فرماتے تو ہوں گے

برقِ نظر وہ دل پہ گرائیں تو کیا کروں
وارفتۂ جمال بنائیں تو کیا کروں

آنکھوں میں جادو چال میں شوخی غرورِ حسن
اس طرح میرے سامنے آئیں تو کیا کروں

کالی گھٹا، فضائے معطر، خنک ہوا
پینے کی مجھ کو یاد دلائیں تو کیا کروں

جام و سبو سے کام نہ صہبا سے واسطہ
وہ مست انکھڑیوں سے پلائیں تو کیا کروں

جون ۵۰ء

شرابِ آتشیں ہے اور میں ہوں
کوئی میرے قریں ہے اور میں ہوں

تصوّر میں کسی کا آستاں ہے
مرا شوقِ جبیں ہے اور میں ہوں

نظر میں دونوں عالم کا ہے جلوہ
خیالِ مہ جبیں ہے اور میں ہوں

نہ پوچھے کوئی لطفِ شادمانی
وہ زلفِ عنبریں ہے اور میں ہوں

مزہ تنہائیاں دیتی ہیں صہبا
کوئی دل میں مکیں ہے اور میں ہوں

جون ۵۰ء

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

بھروسہ دل پہ اب کم ہو رہا ہے
چراغِ زیست مدھم ہو رہا ہے

نہیں تھمتے ہیں اب آنکھوں میں آنسو
کسی کا ذکر پیہم ہو رہا ہے

یہی ہے انتظامِ بزمِ ہستی
خوشی کے ساتھ ماتم ہو رہا ہے

نہیں معلوم کیا ہو رنگِ ہستی
مزاجِ دہر برہم ہو رہا ہے

بس اتنا کوئی کہہ دے جلالؔ سے جا کر
کہ صہباؔ خوگرِ غم ہو رہا ہے

اگست سنہ ۵۰ء

کوئی ان سے کہہ دے نہ اب مسکرانا
نہ دل میں سمانا نہ بجلی گرانا

وہ کرتے رہے خون ارماں کا میرے
ہمیشہ رہا میرا رنگیں فسانا

ہمیشہ رہا بجلیوں ہی کی زد میں
مرا آشیانہ مرا آشیانا

یہی میری منزل یہی میرا مامن
ترا آستانہ ترا آستانا

نہ صہبا نہ ساقی نہ وہ رند باقی
نہ ہنسنا ہنسانا نہ پینا پلانا

جنوری ۱۹۵۱ء

ہوا اپنا برباد جب آشیانہ
کہاں اپنا مسکن کہاں اب ٹھکانہ

نکالا چمن سے مجھے باغباں نے
چلا ہوں جہاں ہے مرا آب و دانہ

بناتا ہوں اے برق مضطر ہو مژدہ
تری رہگذر پر میں اب آشیانہ

یہیں پرسکوں دل کو ملتا ہے میرے
سلامت رہے آپ کا آشیانہ

جسے دیکھیے چشم پُرنم ہے صہبا
سُنے گا بھلا کون اپنا فسانہ

جنوری ۱۹۵۱ء

ہو گا نہ میرے درد کا درماں ترے بغیر
تسکین پائیں گے نہ دل و جاں ترے بغیر

تیرے بغیر لطف نہیں زندگی میں کچھ
رہتا ہوں میں اداس و پریشاں ترے بغیر

غنچوں میں ہے کشش نہ تو پھولوں میں کیف ہے
بے رنگ ہے یہ سارا گلستاں ترے بغیر

تو سازِ زندگی تو ہی مضرابِ زندگی
ہے بے صدا یہ تارِ رگِ جاں ترے بغیر

ہوتا ہے ہر قدم پہ یہ محسوس اب مجھے
سارا جہاں ہے مجھ سے گریزاں ترے بغیر

مقصد ہے تو، مراد ہے تو آرزو ہے تو
ہو گا نہ پُر کبھی مرا داماں ترے بغیر

جام و سبو ہے ساغر و صہبا ہے ابر ہے
سب میکدے کا ہیچ ہے ساماں ترے بغیر

جنوری ۱۹۵۱ء

کبھی درد بن کر وہ دل میں سمائے
تو پھر اشک بن کر وہ آنکھوں میں آئے

ستائے گئے گو زمانہ کے ہاتھوں
مگر حرفِ شکوہ زباں پر نہ لائے

وہ سنتے رہے داستانِ شبِ غم
نہ ہم مسکرائے نہ ہم مسکرائے

جہاں کچھ مداوا نہ ہو دردِ دل کا
کوئی ایسی دنیا سے کیا دل لگائے

کوئی دیکھے صہبا کی مجبوریوں کو
جو مرنا بھی چاہے تو مرنے نہ پائے

فروری ۱۹۵۱ء

بڑھ گئی جب سے دل کی الجھن
کیسا گریباں کیسا دامن

دل میں تم ہو، تم ہو نظر میں
پھر یہ پردہ پھر یہ چلمن؟

میری تمنّا میری حسرت
تیرا جلوہ تیرا درشن

تنکے پریشاں برق ہے مضطر
جل گیا جب سے میرا نشیمن

ان کا تبسّم، برقِ مجسّم
اور دلِ صہبا اس کا خرمن

جولائی ۱۹۵۱ء

کبھی دل غم سے گھبراتا ہی ہوگا
کلیجہ منہ کو آجاتا ہی ہوگا

کبھی آنسو اُمڈ آتے ہی ہوں گے
کبھی طوفان اٹھ جاتا ہی ہوگا

تغافل ہے دلیلِ ربطِ پنہاں
انھیں میرا خیال آتا ہی ہوگا

جلادے برقِ مضطر آشیاں کو
یہ تیری راہ میں آتا ہی ہوگا

گلوں سے کھیلنے والوں کا دامن
کبھی صہبا الجھ جاتا ہی ہوگا

اگست ۱۹۵۶ء

دیکھ کر شان زندگی صہبا موت رہ رہ کے مسکراتی ہے

صہبا کے کلام کی یہ چند خصوصیات ہیں، جو سرسری مطالعے میں بھی نمایاں ہو جاتی ہیں ان خصوصیات کی بنا پر توقع ہوتی ہے کہ یہ مجموعہ ارباب فکر کی نظر میں اپنا مقام پیدا کر لے گا۔

عبدالقادر سروری

حمایت نگر، حیدرآباد دکن
مورخہ ۱۸ر جولائی ۱۹۶۱ء

زندگی کا یہی بس ایک سہارا ہوگا
ہر گھڑی لب پہ مرے نام تمہارا ہوگا

کون کہتا ہے نشیمن پہ گری ہے بجلی
میری قسمت کا چمکتا ہوا تارا ہوگا

سوئے منزل تمہارے واں رک گئے کیوں یہ قدم
اس میں بھی میرے مقدر کا اشارا ہوگا

ہے زمیں اپنی فلک اپنا نہ تارے اپنے
تم ہوئے غیر کے تو کون ہمارا ہوگا

دیں گی طوفان میں موجیں بھی سہارا صہبا
غم نہیں دور اگر مجھ سے کنارا ہوگا

ستمبر ۱۵ء

کیوں ہوائیں ہیں میکدہ بردوش
گم ہوئے جا رہے ہیں عقل و ہوش
کیسی محفل کہاں کا ناؤ نوش
ہم تو مدت ہوئی کہ ہیں خاموش
دل ہی کچھ ایسا مجھ گیا اپنا
وہ امنگیں ہیں اب نہ جوش و خروش
اس نے ڈالی نہ اک اچٹتی نظر
اور ہم بیٹھے ہیں ہمہ تن گوش
غیر ممکن یہاں سکون ملے
اب سکوں دے گا موت کا آغوش
کون جاتا ہے آج دنیا سے
سازِ ہستی کے تار ہیں خاموش
منہ چھپاتے تھے جس سے تم کل تک
وہی صہبا ہوا ہے اب روپوش

ستمبر ۵۱ء

پھر چلے ہیں ان کے در پر آج بے تابانہ ہم
اب سُنائیں گے انھیں کو درد کا افسانہ ہم

ضبط کی حد ہو چکی اب دل جلے یا گھر جلے
دیر سے ہیں منتظر اے جلوۂ جانانہ ہم

میکدہ بر دوش آنکھیں کہہ رہی ہیں آپ کی
مے بھی ہم، مستی بھی ہم، مینا بھی ہم پیمانہ ہم

اب نگاہِ یار میں وہ جلوہ سامانی نہیں
یا نگاہِ یار سے خود ہو گئے بیگانہ ہم

چاہیئے صہبا بگولہ ساں طواف اپنا ہمیں
اپنے سینے میں نہاں رکھتے ہیں آتش خانہ ہم

نومبر ۱۹۵۱ء

کبھی دن بیتے یاد آتے تو ہوں گے
کبھی وہ بھی تڑپ جاتے تو ہوں گے

یہ راتیں اور یہ تاریک راتیں
یقیں ہے وہ بھی گھبراتے تو ہوں گے

یہ مانا ہوں نظر سے دور لیکن
کبھی وہ یاد فرماتے تو ہوں گے

جو دل پر نقش کچھ بیٹھے ہوئے ہیں
کبھی وہ بھی ابھر آتے تو ہوں گے

جفائیں یاد کر کے اپنی صہبا
وہ دل ہی دل میں شرماتے تو ہوں گے

واہ کیا شانِ کبریائی ہے
ذرّہ ذرّہ میں دلربائی ہے

جان پر ایسی کچھ بن آئی ہے
اے خدا بس تری دہائی ہے

سر ترے آستاں سے کیوں اٹھے
دل میں جب شوقِ جبہ سائی ہے

یاد جب ان کی یک بہ یک آئی
میں نے لذت سی دل میں پائی ہے

کیا سنائیں گے حالِ دل صہبا
دل پہ غم کی گھٹا سی چھائی ہے

نومبر ۵۱ء

پھر خیالِ یار میرا رازداں بنتا گیا
دل پہ ہر نقشِ محبت جاوداں بنتا گیا

اُس طرف تھیں بجلیاں بے چین گرنے کے لیے
اِس طرف تنکوں سے میرا آشیاں بنتا گیا

آپ کا غم زندگی کا جب سے عنواں بن گیا
دردِ دل ہی میرے دل کا پاسباں بنتا گیا

حیرتِ جلوہ کہوں یا جلوۂ حیرت کہوں
جو تری محفل میں آیا بے زباں بنتا گیا

ہر روش ان کے قدم سے رشکِ صد گلشن بنی
زینتِ گلشن قدم کا ہر نشاں بنتا گیا

جس کسی نے داستانِ دردِ صہبا کی سنی
رازداں پہلے بنا، پھر ہم زباں بنتا گیا

دسمبر ۵۱ء

پھر صبا ہم کلام ہے شاید
کوئی ان کا پیام ہے شاید

ڈرتے ڈرتے نکل رہا ہے قمر
کوئی بالائے بام ہے شاید

برق کچھ مضطرب سی رہتی ہے
آشیاں ناتمام ہے شاید

بھولنے پر بھی یاد آتے ہیں
یہ بھی اک انتقام ہے شاید

ہونٹ لرزاں ہیں چشم پرنم ہے
لب پہ پھر ان کا نام ہے شاید

زلف بکھرائے کون آیا ہے
منظرِ صبح و شام ہے شاید

ساتھ ساماں ہے مختصر صہبا
مختصر سا قیام ہے شاید

جولائی ۵۲ء

بھولنے پر بھی وہ یاد آئے یہ قصّہ کیا ہے
دل کے سب نقش اُبھر آئے یہ قصّہ کیا ہے

پاس رہ کر جو ملاتا نہ تھا نظروں سے نظر
دور رہ کر مجھے تڑپائے یہ قصّہ کیا ہے

دل کی خواہش ہے کہ ویرانہ سا ویرانہ ہو
اور آبادی سے گھبرائے یہ قصّہ کیا ہے

سیج پھولوں کی سکوں بخش نہیں ہوتی کبھی
نیند کانٹوں پہ بھی آجائے یہ قصّہ کیا ہے

میں نہ دیکھوں تو مجھے دیکھتا رہتا ہے وہ
میں جو دیکھوں تو وہ چھپ جائے یہ قصّہ کیا ہے

سامنے چشمِ سیہ مست اگر ہو صہبا
دل میں میخانہ اتر آئے یہ قصّہ کیا ہے

اگست ۵۲ء

آپ پابند جفا ہیں تو جفا اور سہی
گر یہی طرز ادا ہے تو ادا اور سہی

درد بڑھتا ہی رہے اس کا مداوا ہی نہ ہو
درد کی گر یہ دوا ہے تو دوا اور سہی

غیر تو شاد رہیں اور رہیں ہم ناشاد
گر یہی تیری رضا ہے تو جفا اور سہی

تیرا صہبا تو پیا کرتا ہے آنکھوں سے تری
ہے یہی طور عطا کا تو عطا اور سہی

اگست ۵۲ء

ان سے پھر رسم و راہ ہوتی ہے
پھر خلش گاہ گاہ ہوتی ہے

چار تنکوں پہ آشیانے کے
برق کی پھر نگاہ ہوتی ہے

کیا کہوں کیف ان کی آنکھوں کا
ہر نظر بے پناہ ہوتی ہے

دیکھ کر حال اس کی بخشش کا
مجھ کو فکرِ گناہ ہوتی ہے

اک جفا جو کا ساتھ ہے صہبا
دیکھو کب تک نباہ ہوتی ہے

ستمبر ۵۲ء